وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ

سہ ماہی البیان کراچی

سلسلہ نمبر 24

جنوری تا مارچ
2021ء
بمطابق
جمادی الثانی تا شعبان
1442ھ

سرپرست اعلیٰ
فضیلۃ الشیخ علامہ
عبداللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ

فہرست مضامین

زرِ تعاون بھیجنے اور البیان کے شمارہ جات جاری کروانے کے لیے ذیل میں دیئے گئے نمبر پر رابطہ کریں
تفصیلات کے لیے رابطہ: عبدالمجید محمد حسین بلتستانی/ 0321 0332 2627018

سالانہ بکنگ پر خصوصی رعایت

برائے خط و کتابت: المدینہ ریسرچ سینٹر پوسٹ بکس نمبر 12231، ڈی ایچ اے، کراچی

المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر
AL-Madina Islamic Research Center
جامع مسجد سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، ڈیفنس فیز 4، 11 کمرشل اسٹریٹ
نزد شہید پارک وگذری پولیس اسٹیشن کراچی۔

Ph:+92-21-35896959
Mob 03322135693
WEBSITE:
WWW.ISLAMFORT.COM
E-MAIL
albayanmirc@gmail.com

اداریہ

کوروناویکسین کی شرعی حیثیت،حلال یا حرام؟

عثمان صفدر[1]

کورونا وبا، گزشتہ سال ہمارے حالات اور ہمارے گناہ گزشتہ ایک سال انسانی تاریخ میں اپنے ان مٹ اثرات کی بدولت ہمیشہ یادگار رہے گا، پوری دنیا اپنی تمام تر ترقی وٹیکنالوجی کے باوجود ایک عالمی وبا کا شکار ہوئی، پورا عالم انسانی خوف کا شکار تھا، کاروبارِ دنیا تھم کر رہ گیا، ایک ان دیکھے جرثومہ نے ایسی دہشت پھیلائی کہ لوگ گھروں میں محصور ہوگئے، میڈیکل سائنس کی بلندی کے دعویداروں نے گھٹنے ٹیک دیئے، انسانوں کا ایک دوسرے سے دور رہنا ہی علاج ٹھہرا۔

ہم اس معاملہ کو کچھ بھی کہہ لیں، ایک عالمی وبا یا ایک عالمی سازش، بہرحال یہ ایک آزمائش تھی، ایک فساد وفتنہ تھا، جس نے انسانی زندگی کو تلپٹ کر رکھ دیا، یہ اللہ کا امر تھا جو ہو کر رہتا ہے، ایسا ہوا کیوں؟ اس کی وجہ قرآن نے کچھ یوں بیان کی ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (الروم: 41) ترجمہ: "خشکی اور سمندر میں لوگوں کے اعمال کی وجہ سے فساد برپا ہوگیا ہے تاکہ اللہ لوگوں کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے تاکہ وہ باز آجائیں۔" یقیناً یہ ہمارے گناہ ہی ہیں جو اللہ کے عذاب کا باعث بنتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہمیں بار بار اپنے گناہوں سے رجوع کا موقع فراہم کرتا ہے، اور یقینا بڑے خوش نصیب ہیں جو ان موقعوں سے سیکھتے ہیں، اللہ کی طرف رخ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسے افراد میں شامل فرمائے۔

---

[1] مدیر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

بیماری بھی اللہ تعالی کی طرف سے ہے اور شفا بھی وہی دیتا ہے، اور یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے ہر بیماری کا علاج بھی نازل فرمایا ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ”ما أنزَلَ اللّٰهُ داءً إلَّا أنزَلَ له شِفاءً“[1] ”اللہ تعالی نے ایسی کوئی بیماری نازل نہیں کی جس کی دوا نازل نہ کی ہو۔“ اللہ تعالی کی رحمت کی بدولت حالیہ وبا کا علاج بھی دریافت ہو چکا ہے، جو کہ ویکسین کی صورت میں ہے، یہ اقدامی علاج کی صورت ہے، یعنی بیماری لگنے سے تحفظ کا ذریعہ، یہ علاج کی ایک جدید شکل ہے لیکن اس کا تصور کافی قدیم ہے، اس طریقہ علاج میں انسان کے خود کار مدافعتی نظام کو اس قدر طاقتور بنا دیا جاتا ہے کہ وہ جسم میں اس بیماری کو جگہ بنانے ہی نہیں دیتا، اور یوں انسان اس بیماری کا شکار ہونے سے بچ جاتا ہے، دور حاضر کی کئی بیماریوں خصوصاً وبائی امراض کا علاج ویکسین ہی کے ذریعہ کیا جاتا ہے، جیسا کہ پولیو، سوائن فلو وغیرہ اس کی معروف مثالیں ہیں۔ ویکسین کے تعلق سے دنیا بھر کے بہت سے افراد شک وشبہ میں مبتلا ہوتے ہیں، بعض حضرات اس کو کسی سازش کا حصہ سمجھتے ہیں، بعض اس کی تیاری میں کسی حرام اجزاء کے شامل ہونے کی بنا پر اس کو حرام سمجھتے ہیں، اور یہ شکوک وشبہات خصوصا کورونا ویکسین کے حوالہ سے بہت سے افراد کے ذہنوں میں موجود ہیں۔ اور چونکہ جلد یا بدیر کورونا ویکسین کا یہ سلسلہ ہر عام وخاص تک ضرور پہنچے گا لہٰذا اس معاملہ کو جدید سائنسی تحقیق کے معتبر ذرائع اور شرعی دلائل کی روشنی میں پرکھنا ضروری ہے تاکہ اس کی حلت وحرمت اور نفع ونقصان واضح ہو اور ایک عام مسلمان اس حوالہ سے علی وجہ البصیرہ کوئی فیصلہ کر سکے۔

آئندہ سطور میں ہم عمومی ویکسین کی شرعی حیثیت اور خصوصا کورونا ویکسین کی حلت وحرمت کا جائزہ جدید میڈیکل سائنس وشرعی دلائل کی روشنی میں پیش کریں گے۔

ویکسین: طبی تعارف اور شرعی حیثیت۔ (مختلف ویکسین کے متعلق فقہی کمیٹیوں وعلماء کی آراء)

لفظ Vaccine لاطینی زبان کے لفظ Vacca سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے گائے، اس کی تاریخ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک برطانوی سائنسدان ایڈورڈ جینر نے 1796 میں Smallpox

[1] صحيح بخاري ، كتاب الطب ، باب ما أنزل الله داء إلا أنزل له شفاء، 5678۔

یعنی چیچک کی بیماری کے لئے گائے کی ایک متعدی بیماری Cowpox کا وائرس لے کر پہلی ویکسین بنائی تھی، اور کیونکہ یہ وائرس گائے سے لیا گیا تھا۔ لہٰذا اس دوائی کو Vaccine یعنی "گائے سے ماخوذ" کہا جانے لگا۔[1]

میڈیکل سائنس میں ویکسین کی مختلف تعریفات ذکر کی جاتی ہیں، Oxford Dictionary of Biochemistry and Molecular Biology میں ویکسین کی تعریف یوں ذکر کی گئی ہے:

> Any preparation of immunogenic material suitable for the stimulation of active immunity in animals without inducing disease. Vaccines may be based on dead or attenuated microorganisms altered toxins(toxoids) or viruses[2].

یعنی ویکسین سے مراد ایسے مدافعتی مواد کی تیاری جو کسی مرض کا سبب بنے بغیر جانداروں میں موجود مدافعتی نظام کو متحرک کر سکے۔ ویکسین کسی مردہ یا کمزور جرثوموں، متغیر زہریلے مادہ، یا وائرس پر مشتمل ہوسکتی ہے۔ اس تعارف سے دو امور واضح ہوتے ہیں:

(ا) ویکسین کوئی دوا نہیں ہے، بلکہ یہ انسانی جسم میں موجود خودکار مدافعتی نظام کو متحرک کرنے کا ذریعہ ہے۔

(ب) ویکسین میں کسی بیماری یا اسی بیماری کا جرثومہ یا وائرس ہوسکتا ہے جس سے بچاؤ مقصود ہے۔

ویکسین کی شرعی حیثیت

جیسا کہ درج بالا تفصیل سے واضح ہوگیا کہ ویکسین ایک اقدامی تحفظ کا ذریعہ ہے، اور یہ ایک صحت مند آدمی کو آئندہ کے تحفظ کے پیش نظر لگائی جاتی ہے، اور اس میں گویا کہ مرض کو ایک صحت مند آدمی پر پیش کیا جاتا ہے، اس لئے ویکسین کے اس عمل کے متعلق اہل اسلام میں شکوک وشبہات

---

[1] https://:www.britannica.com/science/vaccine

[2] Oxford Dictionary of Biochemistry and Molecular Biology (2 ed)Vaccine

پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک اقدامی تحفظ کا تعلق ہے تو شریعت کے مقاصد کے پیش نظر ہمیں یہ بات بالکل واضح معلوم ہوتی ہے کہ آئندہ آنے والے نقصان سے اقدامی تحفظ ہمیشہ سے شریعت کا مقصود رہا ہے، چاہے اخروی خسارہ سے محفوظ رہنے کے لئے دنیا میں عمل کرنے کی بات ہو، شیطان سے حفاظت اور دنیاوی آفات سے بچاؤ کے لئے صبح وشام کے اذکار ہوں، بدکاری سے بچنے کے لئے نظروں کا جھکانا ہو، یا حرام سے بچنے کے لئے مشتبہ چیزوں کو ترک کرنے کا بیان ہو، ہمیں ہر معاملہ میں اقدامی تحفظ کا درس دیا گیا ہے، بلکہ کھانے پینے کے معاملہ میں اور علاج کے حوالہ سے بھی نبی کریم ﷺ کے فرامین ہمیں یہی تعلیم دیتے ہیں، جیسا کہ صحیح بخاری میں ایک حدیث مبارک ہے کہ:

”مَنْ تَصَبَّحَ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعَ تَمَرَاتٍ عَجْوَةً، لَمْ يَضُرَّهُ فِي ذَلِكَ اليَوْمِ سُمٌّ وَلَا سِحْرٌ“[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے ہر دن صبح کے وقت سات عجوہ کھجوریں کھالیں، اسے اس دن نہ زہر نقصان پہنچا سکے گا اور نہ جادو۔“ یعنی زہر اور جادو سے بچنے کے اقدامی تحفظ کے لئے یہ عمل کرنا سنت ہے۔

البتہ جہاں تک بڑی بیماری سے خود کو محفوظ کرنے کے لئے معمولی بیماری از خود لگا لینا، یا زہریلا مواد اپنے جسم میں انجیکٹ کرنے اور اسی طرح کے دیگر نقصان دہ امور کا معاملہ ہے تو اس مسئلہ کی تفصیل اور علماء کی آراء ہم کورونا ویکسین کی شرعی تفصیلات میں ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ

ویکسین کی تاریخ

اس حوالہ سے یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ ویکسین طریقہ علاج کی دریافت یورپ نے کی تھی جیسا کہ ویکسین کے تعارف میں ایک برطانوی سائنسدان ایڈورڈ جینر کا تذکرہ گزرا ہے کہ اس نے چیچک کی ویکسین دریافت کی تھی، جب کہ خود اہل مغرب کے کئی محققین نے اس دعوی کی تردید کی ہے، بلکہ اس دریافت کا سہرا ابتدائی طور پر چینی باشندوں کے پاس ہے، اور اس دریافت کو مزید ترقی اور عروج مسلمانوں نے دیا، جیسا کہ برطانوی سائنسدان گیرتھ ولیم Gareth Williams نے اپنی کتاب Angel of Death جو کہ چیچک کی تباہ کن تاریخ پر مشتمل ہے میں ذکر کیا ہے کہ معروف برطانوی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الأطعمة، باب العجوة، حدیث: 4555

مصنفہ اور شاعرہ Lady Mary Montague لیڈی مونتاج نے پہلی دفعہ چیچک کی ویکسین کا مظاہرہ سنہ 1717ء میں ترکی استنبول میں خلافت عثمانیہ کے شاہی طبیبوں کے ہاتھوں دیکھا جب ان کے شوہر برطانیہ کے سفیر کے طور پر استنبول میں موجود تھے اور 1718ء میں انہوں نے اپنے پانچ سالہ بیٹے کو چیچک کی ویکسین بھی لگائی۔[1] اور یہ بات لیڈی مونتاج نے اپنے کئی دوستوں کو خطوط کے ذریعہ بھی بتائی تھی۔[2] اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جدید دنیا میں ویکسین کا تصور سب سے پہلے مسلمانوں نے دیا اور طویل عرصہ کے بعد یہ تصور یورپ پہنچا، اور پھر یہ طریقہ علاج متعدد بیماریوں خصوصا وبائی امراض کے لئے استعمال ہونے لگا۔

کورونا ویکسین کی شرعی حیثیت

ویکسین کے حوالہ سے بات ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اس طریقہ علاج کا شرعی تصور موجود ہے، البتہ ویکسین میں شامل اجزاء اور ویکسین کے اثرات کے تعلق سے کافی شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں جو کہ اس کی شرعی حیثیت کو متاثر کرتے ہیں۔اور یہی اعتراضات کورونا ویکسین پر بھی ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کورونا ویکسین کی مختلف اقسام ہیں، جو کہ مختلف طریقہ کار کے ذریعہ بنائی جاتی ہیں۔ابھی تک کورونا ویکسین کی چار اقسام سامنے آئی ہیں:

1) WHOLE VIRUS VACCINE

2) NON-REPLICATING VIRAL VECTOR

3) PROTEIN SUBUNIT

ان تینوں اقسام میں مکمل وائرس انتہائی کمزور صورت میں یا وائرس کا کچھ حصہ جسم میں داخل کیا جاتا ہے تاکہ جسم کا خود کار مدافعتی نظام اس کے خلاف متحرک ہوجائے اور آئندہ کے لئے جسم میں ایک دفاعی نظام تشکیل پاجائے۔زیادہ تر ویکسین انہی اقسام پر مبنی ہوتی ہیں، اور چونکہ اس میں کسی

---

[1] Williams G(2010) Angel of Death

[2] Lady Mary Wortley Montagu: Selected Letters. Ed. Isobel Grundy. Penguin Books, 1997

حد تک وائرس کسی نہ کسی صورت میں ہوتا ہے اس لئے اس کے سائیڈ ایفیکٹ بھی ہوتے ہیں، اور اس میں ایسے مشتبہ عناصر جو خنزیر یا کسی اور حرام جانور سے ماخوذ ہوں اس کی موجودگی بھی ہو سکتی ہے۔

پاکستان میں جو چائینز ویکسین لگائی جارہی ہے وہ انہی اقسام پر مشتمل ہے۔

4) RNA or mRNA VACCINE

اس ویکسین کو genetic messenger بھی کہا جاتا ہے، اس میں وائرس موجود نہیں ہوتا بلکہ انسانی جسم کے خلیات کے لئے معلومات ہوتی ہیں جس کی بنیاد پر مدافعتی نظام اس وائرس کے خلاف دفاعی نظام تشکیل دیتا ہے۔ کورونا سے بچاؤ کے لئے سب سے پہلے جو ویکسین بنائی گئی وہ اسی طریقہ کار کے ذریعہ بنائی گئی تھی جسے Pfizer-BioNTech نامی کمپنی نے بنایا تھا۔[1] اس ویکسین میں چونکہ وائرس موجود نہیں ہوتا اس لئے اس کے سائیڈ ایفیکٹ بھی بہت کم ہوتے ہیں اور چونکہ یہ ایک مصنوعی انداز سے بنائی جاتی ہے اس لئے اس میں حرام اجزاء وعناصر کی شمولیت کا امکان بھی کم ہوتا ہے۔ بلکہ امریکی ادارہ FDA نے اس ویکسین کے اجزاء کی جو فہرست جاری کی ہے اس کے مطابق اس میں بظاہر کسی حرام عنصر کی شمولیت نظر نہیں آتی۔[2] اور خود Pfizer نے اپنی ویب سائٹ پر اس بات کا دعوی کیا ہے کہ اس کی ویکسین میں کسی جاندار سے اخذ کردہ عناصر شامل نہیں ہیں۔

عمومی طور پر ویکسین میں حرام اجزاء کی شمولیت یا تو براہ راست ہوتی ہے کہ خنزیر کے جسم سے کشید کردہ اجزاء ویکسین میں شامل کردیئے جائیں، جیسا کہ Porcine Gelatin اکثر ویکسین میں شامل کیا جاتا ہے، یا بسا اوقات ویکسین میں شامل کردہ بعض عناصر کی تیاری کے مراحل میں کہیں خنزیر یا حرام جانوروں سے ماخوذ عناصر استعمال ہوتے ہیں، جیسا کہ بعض عناصر کی تیاری میں enzyme استعمال ہوتا ہے جو کہ اکثر خنزیر سے کشید کردہ ہے۔ اور کورونا ویکسین میں دونوں طرح کے حرام اجزاء کی شمولیت کا قوی امکان ہے۔ اور یہ امکان اس وقت زیادہ قوی ہوجاتا ہے جب ہم

---

[1] https//:www.who.int/news-room/feature-stories/detail/the-race- for-a-covid-19-vaccine-explained

[2] https//:www.fda.gov/media/144414/download

دیکھتے ہیں کہ ان ویکسین کو ایجاد کرنے والی کمپنیوں نے ان کے اجزاء کی تفصیلات آج تک مہیا نہیں کی ہیں، اور گزشتہ سالوں میں جو ویکسین تیار ہوتی رہی ہیں ان میں حرام اجزاء کی شمولیت واضح ہے، خاص طور پر سوائن فلو اور Rota virus کی ویکسین اس کی بڑی مثال ہیں۔

اب ایک مسلمان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کورونا ویکسین میں حرام اجزاء کی شمولیت ہو تو اسے استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ ایک صحتمند آدمی کو جان بوجھ کر خود کو بیماری لگانا شرعی اعتبار سے درست ہے یا نہیں۔ ایک بات تو واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حرام اشیاء سے علاج کرنے سے منع فرمایا ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے: ”لاَ تَدَاوَوْا بِحَرَامٍ“۔ [1] کہ حرام چیز کے ساتھ علاج مت کرو۔ اس طرح کی اور کئی احادیث ہیں جن میں آپ ﷺ نے حرام سے علاج کی ممانعت فرمائی ہے۔ اسی لئے علماء کرام نے اس طرح کی ادویات اور ویکسین جن میں حرام اجزاء شامل ہوں ان کے حوالہ سے مختلف شرعی و فقہی اصول و قواعد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ اور بنیادی طور پر دو موقف سامنے آئے ہیں۔ بعض نے اسے استحالہ کی بنیاد پر حلال قرار دیا ہے اور بعض علماء و فتاوی کمیٹی نے فقط ضرورت و مجبوری کے تحت اجازت دی ہے۔ آئندہ سطور میں ہم انہی اصول و قواعد کو سامنے رکھتے ہوئے کورونا ویکسین کی شرعی حیثیت پر گفتگو کریں گے۔

پہلا قاعدہ: استحالہ

PHYSICAL AND CHEMICAL TRANSFORMATION

استحالہ کا بنیادی شرعی مفہوم یہ ہے کہ حرام و نجس چیز اپنی ماہیت و حالت کو تبدیل کر کے ایک حلال و پاک چیز کی ماہیت و حالت میں اس طرح بدل جائے کہ پہلی ماہیت کی کوئی صفت اور علامت یا کیفیت اس میں موجود نہ ہو، بلکہ اس کا نام ہی تبدیل ہو کر رہ جائے۔ [2] یہ تبدیلی فطری

---

[1] سنن ابو داود ، كتاب الطب ، باب في الأدوية المكروهة، حديث: 3874۔ امام البانی فرماتے ہیں: یہ حدیث اپنے شواہد کی بنیاد پر صحیح ہے (التعليقات الرضية على الروضة الندية :(154/3)

[2] الموسوعة الفقهية الكويتية (213/3)

طریقہ سے بھی ہوسکتی ہے جیسا کہ شراب کا خودبخود سرکہ میں بدل جانا اور یہ تبدیلی کسی انسان کی مداخلت کا نتیجہ بھی ہوسکتی ہے کہ شراب میں کوئی ایسا کیمیکل ڈال دیا جائے جس سے وہ سرکہ میں بدل جائے۔

شراب کا خودبخود سرکہ بن جانے کی صورت میں اس کے حلال ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے،[1] کیونکہ نبی کریم ﷺ نے سرکہ کو بہترین کھانا قرار دیا ہے،[2] اور سرکہ بننے کے مراحل میں سرکہ سے پہلے پھلوں کے اس رس میں کسی حد تک نشہ موجود ہوتا ہے جو کہ Ethanol کی صورت میں ہوتا ہے اور جب یہ ethanol اپنی ماہیت تبدیل کر کے acetic acid میں بدل جاتا ہے تو پھلوں کا یہ رس سرکہ کی شکل اختیار کرجاتا ہے اور اس میں سے نشہ ختم ہوجاتا ہے۔ البتہ اگر یہ تبدیلی کسی انسان کی مداخلت کا نتیجہ ہو تو اس میں علماء کا اختلاف ہے جس کی تفصیل آئندہ سطور میں ذکر ہوگی۔

شراب کے علاوہ دیگر حرام ونجس اشیاء کے استحالہ میں علماء کا اختلاف ہے، تاہم استحالہ اگر فطری طریقہ سے ہو تو جمہور علماء نے اس کا اعتبار کیا ہے، اور یہ موقف احناف،[3] مالکیہ،[4] بعض حنابلہ،[5] امام ابن حزم،[6] شیخ الاسلام ابن تیمیہ،[7] اور حافظ ابن قیم رحمہم اللہ[8] کا ہے، اور اسی کے مطابق سعودی عرب کی لجنہ دائمہ[9] کا فتوی بھی موجود ہے۔

تاہم اگر استحالہ چاہے شراب کا سرکہ میں بدل جانا ہو یا نجس کا حلال میں، اگر یہ کسی انسان کے

---

[1] مجموع الفتاوى، لابن تيميّة (502/21)

[2] صحيح مسلم :، كتاب الأشربة ، باب فضيلة الخل والتأدم به، حديث: 2052

[3] تبيين الحقائق للزيلعي (220/6)

[4] الذخيرة للقرافي (188/1).

[5] الإنصاف للمرداوي (318/1)

[6] المحلى۔ (100/6)

[7] مجموع فتاوى ابن تيميّة (522/20)

[8] أعلام الموقعين (14/2)

[9] فتاوى اللجنة الدائمة- المجموعة الأولى۔ (299/22)

ارادہ اور مداخلت کے نتیجہ میں ہوا ہوتو جمہور علماء اس کے حلال و پاک ہونے کے قائل نہیں ہیں، اور یہ موقف امام مالک، [1] امام شافعی [2]، امام احمد [3]، شیخ الاسلام ابن تیمیہ [4]، اور حافظ ابن قیم [5] کا ہے، بلکہ امام نووی نے اسے علماء کی اکثریت کا موقف بیان کیا ہے، [6] اور اسی کے مطابق سعودی عرب کی لجنہ کبار علماء کا فتوی بھی موجود ہے۔ [7] اور اس کی دلیل صحیح مسلم کی یہ حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ سے صحابہ کرام نے پوچھا کہ کیا ہم شراب کو سرکہ میں بدل لیں تو آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ [8]

البتہ احناف کا موقف یہ ہے کہ چاہے استحالہ فطری ہو یا مصنوعی ہو اس کے ذریعہ حرام چیز حلال ہوجاتی ہے، کیونکہ اس حرام چیز کے حرام ہونے کی علت ختم ہوچکی ہے، اور کسی بھی چیز کا حکم اس کی علت کی بنیاد پر ہی لگتا ہے تو اگر شراب سے نشہ ختم ہوجائے اور وہ سرکہ میں بدل جائے چاہے وہ فطری طریقہ سے ہو یا مصنوعی طریقہ سے وہ سرکہ حلال و پاک ہوجائے گا۔ اور خاص طور پر اگر عموم بلوی ہو یعنی عوام الناس اس میں مبتلا ہوجائیں تو اس صورت میں بالاولی اس کا حکم حلال کا ہوگا۔ [9]

کورونا ویکسین میں استحالہ کا اطلاق یوں ہے کہ Porcine gelatin اور ایسے بیکٹیریا جو خنزیر سے کشید کردہ enzyme میں پروسیس کیئے جاتے ہیں، اور اسی طرح خنزیر سے کشید کردہ دیگر اجزاء وعناصر اس transformation سے گزر کر اپنی ماہیت وحالت تبدیل کر چکے ہوتے ہیں، اور ان میں اب خنزیر کے عناصر کا وجود مٹ چکا ہوتا ہے لہذا استحالہ کی بنیاد پر ان کا حکم حلال کا

---

[1] الكافي في فقه أهل المدينة۔(443/1

[2] المجموع للنووي (576/2

[3] المغني لابن قدامة (172/9)

[4] مجموع الفتاوى۔ (483/21)

[5] إغاثة اللهفان۔ (11/2)

[6] المجموع۔ (576/2)

[7] فتاوى اللجنة الدائمة- المجموعة الأولى (109/22)

[8] صحيح مسلم،كتاب الأشربة،باب تحريم تخليل الخمر،حديث:1983

[9] حاشیه ابن عابدين (316/1)

ہوگا۔ یہ فتوی ان علماء کا ہے جو مصنوعی استحالہ کے حلال ہونے کے قائل ہیں، دنیا بھر کی مختلف علماء کمیٹیوں نے یہ فتوی جاری کیا ہے، جن میں:

1) متحدہ عرب امارات کی مجلس افتاء۔[1]

2)Islamic Organization for Medical Sciences Kuwait[2]

3)British Islamic Medical Association[3]

4)Islamic Religious Council of Singapore[4] شامل ہیں۔

جبکہ Malaysian National Fatwa Committee کے کئی اراکین وعلماء نے ایسی کورونا ویکسین کو حرام اور نجس قرار دیا ہے جس میں خنزیر کے عناصر شامل ہوں چاہے استحالہ کے عمل سے ہی گزرے ہوں، اوراس کی انہوں نے تین بنیادی وجوہات ذکر کی ہیں:

❶ شراب کے استحالہ پر ویکسین کے استحالہ کو قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ شراب میں کسی بیرونی حرام چیز کی ملاوٹ نہیں کی جاتی بلکہ وہ خود ہی حرام سے حلال میں تبدیل ہوجاتی ہے، جبکہ ویکسین میں حلال اشیاء میں حرام عناصر کو ملایا جاتا ہے۔

❷ ویکسین کی تیاری میں استحالہ کی غرض سے حرام وحلال اجزاء کی ملاوٹ دانستہ کی جاتی ہے، جبکہ شریعت نے فقط ایسے استحالہ کا اعتبار کیا جو فطری ہو اور دانستہ ومصنوعی نہ ہو۔

❸ ویکسین میں استحالہ مکمل طور پر نہیں ہوتا، یعنی حرام اجزاء کو لیبارٹری کے تجربات کے ذریعہ باآسانی شناخت کیا جاسکتا ہے، تو اس کا معنی یہ ہوا کہ نجس چیز بعینہ موجود ہے اوراس نے اپنی حالت کو تبدیل نہیں کیا۔[5]

---

[1] فتوى مجلس الإمارات للإفتاء الشرعي، رقم (15) لسنة 2020م

[2] Islamic Organization for Medical Sciences Kuwait(IOMS)(1997.(Recommendations of the 9thFiqh-Medical Seminar.http//:islamset.net/bioethics/9thfiqh.html

[3] https//:britishima.org/covid19-vaccine-az/

[4] https//:www.muis.gov.sg/officeofthemufti/Irsyad/Part-11-Religious-position-on-COVID-19-vaccine-English

[5] Journal of Critical Reviews,Vol 7,Issue 7,2020,FATWA DEBATE ON PORCINE DERIVATIVES IN VACCINE

ان نکات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس استحالہ کا فتاوی کمیٹیوں نے اعتبار کیا ہے اس میں کئی حوالوں سے کمزوری موجود ہے اوراس اصول پر نظر ثانی کی بہت گنجائش ہے۔

دوسرا قاعدہ: استہلاک

بعض علماء نے استحالہ کے اصول کے بجائے استہلاک کا اصول پیش کیا ہے، جو کہ استحالہ کی ہی ایک صورت ہے، استہلاک کا مفہوم یہ ہے کہ قلیل حرام میں اس قدر حلال کی آمیزش کردی جائے وہ حرام اس میں ہلاک یعنی فنا ہوجائے۔اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: جب پانی دو قلے (تقریبا **230** لیٹر) ہوتو اسے کوئی چیز نجس نہیں کرتی۔یعنی اگر اس پانی میں نجاست گرجائے تو پانی کی یہ کثیر تعداد اس کو پاک کردیتی ہے،[1] اسی طرح ایک حدیث میں آپ ﷺ نے سمندر کے پانی کے متعلق فرمایا: اس کا پانی پاک ہے، اوراس کا مردار حلال ہے۔[2] اس کی ایک مثال جو فقہ کی کتابوں میں اکثر و بیشتر دی جاتی ہے کہ اگر کوئی پانی نجس ہوتو اس میں کثیر تعداد میں پاک پانی ملادیا جائے جس میں وہ نجاست فنا ہوجائے اور پانی کا رنگ، بواور ذائقہ بدل کر پاکیزہ ہوجائے۔

ویکسین میں استہلاک کا اصول Islamic Religious Council of Singapore نے پیش کیا ہے، اوراس اصول کی تطبیق Rota virus کے متعلق اپنے فتوی میں Trypsin solution کے حوالہ سے ذکر کیا ہے، جس میں خنزیر سے کشید کردہ enzyme کی بہت قلیل مقدار جو کہ کمیٹی کے مطابق (0.0001٪) فیصد ہوتی ہے۔لہٰذا کمیٹی کے مطابق دیگر حلال اجزاء کی کثرت کی بناء پر یہ عنصر فنا ہوجائے گا اوراس کو حلال قرار دیا جائے گا۔[3] درج بالا فتاوی کمیٹیوں نے اس اصول کو کورونا ویکسین پر بھی منطبق کیا ہے، لیکن اس اصول کی عملی تطبیق کے لئے حرام اجزاء کی صحیح مقدار اور حلال اجزاء کی کثیر مقدار کا معلوم ہونا ضروری ہے۔اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس کثیر تعداد کی بنا پر حرام اجزاء تحلیل ہوئے یا باقی رہے؟۔جبکہ یہ معلومات ابھی تک میسر نہیں ہیں۔

---

[1] سنن ابی داود، کتاب الطھارۃ،باب ما ینجس الماء، حدیث:63

[2] سنن ابی داود، کتاب الطھارۃ،باب ما ینجس الماء، حدیث : 83

[3] https//:www.muis.gov.sg/officeofthemufti/Fatwa/English-Rotavirus-Vaccine

لہٰذا اس اصول کا بھی کورونا ویکسین کے معاملہ میں استعمال درست نہ ہوگا۔

تیسرا قاعدہ: عند الضرورۃ

شریعت کا قاعدہ ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات، یعنی ضرورت حرام چیز کو حلال کر دیتی ہے، اور یہ قاعدہ قرآن مجید کی ان آیات سے ماخوذ ہے جس میں اللہ تعالی نے حرام اشیاء کے تذکرہ کے بعد مجبور کے لئے ان کا استعمال جائز فرمایا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے ﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (البقرۃ: 173) ترجمہ: ''تم پر مردہ اور (بہا ہوا) خون اور سور کا گوشت اور ہر وہ چیز جس پر اللہ کے سوا دوسروں کا نام پکارا گیا ہو حرام ہے، پھر جو مجبور ہو جائے اور وہ حد سے بڑھنے والا اور زیادتی کرنے والا نہ ہو، اس پر ان کے کھانے میں کوئی پابندی نہیں، اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔
اسی طرح فرمایا: ﴿وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ﴾ (الانعام: 119) ترجمہ: ''اور بلا شبہ اس نے تمھارے لیے وہ چیزیں کھول کر بیان کر دی ہیں جو اس نے تم پر حرام کی ہیں، مگر جس کی طرف تم مجبور کر دیے جاؤ۔''

علماء کا موقف ہے کہ چونکہ کورونا میں بھی جان کا خطرہ ہے اور یہ وبا پوری دنیا میں منتشر ہے اور اس کا علاج فی الحال محض ویکسین ہی ہے لہٰذا ویکسین کا استعمال جائز ہے چاہے اس میں کسی حد تک حرام اشیاء شامل ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ اللہ تعالی نے جان بچانے کے لئے براہ راست خنزیر کھانے کی اجازت دی ہے، لہٰذا اس جان لیوا بیماری سے بچاؤ کے لئے ایسی دوا جس میں خنزیر کے کچھ عناصر شامل ہوں اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ موقف متحدہ عرب امارت کی مجلس افتاء [1] اور مصر کی دار الافتاء کمیٹی [2] کا ہے۔ اور یہ موقف کسی حد تک وجیہ اور قابل التفات ہے۔

---

[1] فتوى مجلس الإمارات للإفتاء الشرعي، رقم (15) لسنة 2020م
[2] https//:www.dar-alifta.org/AR/Viewstatement.aspx?sec=media&ID=7406

خلاصہ کلام

کورونا ویکسین کی وہ قسم جو RNA کہلاتی ہے وہ شرعی اعتبار سے باقی اقسام سے بہت حد تک بہتر ہے، اگر چہ اس کے پروسیس کے حوالہ سے چند علماء نے سوالات اٹھائے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس میں شبہ نہایت کم ہے، البتہ دیگر اقسام میں عناصر خنزیر وحرام اجزاء کی شمولیت کا قوی امکان ہے بلکہ بعض علماء وڈاکٹرز حضرات نے شمولیت ثابت بھی کی ہے، ان اقسام کے متعلق علماء کی آراء ومواقف کے مطالعہ و بحث کے بعد جو بات میرے نزدیک راجح اور اطمینان بخش ہے وہ یہ ہے کہ ویکسین کے معاملہ میں استحالہ اور استہلاک کا اصول شرعی وعملی اعتبار سے کافی حد تک کمزور ہے، اور اس میں بہت سے مخفی پہلو ہیں جن کے بارے میں ہم ابھی آگاہ نہیں ہیں، البتہ ضرورت کے تحت اس کا استعمال اس شخص کے لئے جائز ہے جو جسمانی صحت کے لحاظ سے کمزور ہو اور اس کو دیگر عوارض و بیماریاں بھی لاحق ہوں۔

ایک اعتراض

ویکسین کے نتیجہ میں ہونے والے سائیڈ ایفیکٹس کے باوجود ویکسین لگانا اور خود کو دانستہ بیماری لگانا جائز ہے؟

یقیناً شریعت نے خود کو نقصان پہنچانے سے منع فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا﴾ (البقرۃ:195) یعنی اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ لیکن اگر انسان چھوٹا نقصان اٹھا کر بڑے نقصان سے محفوظ ہو سکتا ہو تو شریعت وعقل اسی کی موافقت کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ علماء نے زہر کے ذریعہ علاج کو جائز قرار دیا ہے، حالانکہ زہر انسان کے لئے قاتل ثابت ہو سکتا ہے لیکن اگر اس کی تھوڑی مقدار سے اگر کسی بیماری سے شفا مل سکے تو اس میں حرج نہیں ہے، امام شافعی فرماتے ہیں: ایسی دوا جس میں تھوڑا زہر بھی شامل ہو اسے پینے میں کوئی حرج نہیں ہے، [1] اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’اگر کسی جسمانی فائدے کی

[1] الام (1 / 88)

غرض سے زہر کی کم مقدار کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی چیز ملا لیں جس سے زہر کا اثر کم ہوجائے تو اس کا استعمال جائز ہے۔''[1] اور ہم بھی یہ ملاحظہ کرتے رہتے ہیں کہ بہت سی ادویات ایسی ہوتی ہیں جن کے کچھ نہ کچھ سائیڈ ایفیکٹ ہوتے ہیں لیکن اصل بیماری کو ختم کرنے کے لئے ان مضر اثرات کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

کورونا ویکسین کے متعلق دیگر خدشات!

کورونا وبا کے آغاز سے ہی بہت سی باتیں وافواہیں زبان زد عام ہیں، کوئی اسے یہودی سازش قرار دیتا ہے کوئی بل گیٹس کا عالمی منصوبہ قرار دیتا ہے، اور کوئی ون ورلڈ آرڈر کی تکمیل قرار دیتا ہے، اسی طرح کورونا ویکسین کے تعلق سے بھی جتنے منہ اتنی باتیں کے مصداق قسم قسم کی افواہیں گردش میں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صہیونی منصوبہ جات وسازشوں نے پوری دنیا کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے، اور معاشی نظام سے لے کر سیاسیات، عسکریات، اور میڈیا سے لے کر میڈیکل تک یہ جال پھیلا ہوا ہے، لیکن اول واہم یہ ہے کہ ہم نہ بھولیں کہ قادر مطلق ذات صرف اللہ کی ہے، جو بندوں کے عزائم کا پابند نہیں ہے، اس کے اپنے ارادے ہیں جو ﴿كُنْ فَيَكُونُ﴾ سے پورے ہوجاتے ہیں، اور اللہ تعالی کو کوئی قوت عاجز نہیں کرسکتی، ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ﴾ (التوبۃ: 2) جان لو تم اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے۔۔۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ دور فتنوں کا ہے، اس دور میں ہر بات کے حوالہ سے پہلے تحقیق ضرور کرلینی چاہئے اور بغیر کسی دلیل وبرہان کے کوئی بات نہیں کرنی چاہئے، کورونا وبا اور اس کی ویکسین کے متعلق باتیں تو بہت سی زبان زد عام ہیں لیکن حقائق ودلائل سے تہی دامن ہیں، بعض باتیں تو نہایت بے سروپا ہیں، لہٰذا ہمیں اللہ تعالی سے عافیت کا سوال کرنا چاہئے اور معتبر افراد چاہے وہ علماء ہوں یا اطباء ہوں ان کے مشورے ورہنمائی کے مطابق چلنا چاہئے۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب

---

[1] فتح الباري: (248/10)

رمضان المبارک
و اعتکاف کے احکام و مسائل

جمع و ترتیب: عبدالمجید محمد حسین بلتستانی[1]

نیکیوں اور رحمتوں کے موسم بہار کی آمد آمد ہے، اس ماہ مقدس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے خصوصی عنایات اور مہربانیاں ہوتی ہیں، خوابِ غفلت میں پڑے انسان کو توبہ اور انابت کے مواقع نصیب ہوتے ہیں، اس مقدس ماہ میں روزہ، قیام اللیل ہر عبادت کی اپنی لذت ہوتی ہے۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان عالی شان ہے

”من صام رمضان إيمانا واحتسابا غفرله ماتقدم من ذنبه “[2]

ترجمہ: جس نے رمضان کے روزے ایمان کے حالت میں اور ثواب کی نیت سے رکھے اس کے سارے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔

ایک اور روایت میں اس بابرکت ماہ کی بابت فرمایا:

” إذا جاء رمضان فتحت أبواب الجنة وغلقت أبواب النار وصفدت الشياطين “[3]

ترجمہ: ”جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں ،جہنم کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے“۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس مقدس ماہ میں خوب محنت کی جائے، گناہوں سے توبہ کر کے جہنم

---

[1] فاضل مدینہ یونیورسٹی، ریسرچ اسکالر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر ڈیفنس کراچی۔

[2] صحیح بخاری :38، صحیح مسلم :760

[3] صحیح بخاری :1899، صحیح مسلم :1030

کی آگ سے نجات حاصل کی جائے، اور حصولِ تقویٰ کے بعد شیاطین کے مکر وفریب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا جائے۔اس مضمون میں اس ماہ مقدس کے حوالے کچھ مسائل واحکام بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان شاء اللہ العزیز۔

1 روزے کا معنی

عربی زبان میں روزے کو''صوم'' کہا جاتا ہے، جس کے لغوی معنی '' رک جانے'' کے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے:''طلوع فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک ثواب کی نیت کے ساتھ ان تمام چیزوں سے اجتناب کرنا جن کے ارتکاب سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے''[1]

2 روزہ کے ارکان

اس کے تین رکن ہیں 1 نیت کے بغیر کوئی عمل قابل قبول نہیں اور فرض روزہ کے لیے طلوع فجر سے قبل نیت ضروری ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

'' من لم يجمع النية قبل الفجرفلاصيام له ''[2]

''جس نے فجر سے پہلے روزہ کی نیت نہیں کی اس کا روزہ ہی نہیں۔''

نفلی روزہ کے لیے کسی بھی وقت نیت کی جاسکتی ہے بشرطیکہ خلافِ روزہ کوئی کام نہ کیا ہو[3]

نیز نیت دل کا عمل ہے روزے کے لیے زبان سے نیت کرنا شرعاً ثابت نہیں ہے۔

2 روزہ کو توڑ دینے والے امور سے اجتناب کرنا۔

3 روزہ کے لیے بیان کردہ وقت (طلوعِ فجر سے لے کر غروبِ آفتاب) کی پابندی نہایت ضروری ہے۔

3 روزہ کن پر فرض ہے؟

ہر اس شخص پر فرض ہے جس میں یہ شرائط پائی جاتی ہوں: مسلمان ہو، مکلّف ہو، روزہ رکھنے کی

---

[1] تفسیر قرطبی 269/2

[2] سنن ابی داؤد:2454،جامع ترمذی :730،سنن نسائی :2331

[3] صحیح مسلم:1154،سنن ابی داؤد:2520

قدرت رکھتا ہو جیسا کہ اللہ پاک کا فرمان ہے:

﴿فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ﴾[سورہ البقرہ:185]

''تم میں سے جو بھی اس مہینہ کو پائے وہ روزہ رکھے۔''

اس آیت سے واضح ہوا کہ ہر بالغ مکلف مسلمان پر روزہ فرض ہے، اس عموم سے وہ خارج ہیں جن کا استثناء قرآن وحدیث میں آیا ہے جیسے نابالغ، مسافر، حیض، حمل اور دودھ پلانے والی عورتیں نیز بیمار، اورشرعی معذور وغیرہ۔

4 رمضان المبارک کی ابتداء

رمضان کے روزے کے لیے رؤیتِ ہلال ضروری ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو اگر (انتیس شعبان کو) بادل ہوں تو شعبان کے تیس دن مکمل کر کے رمضان کے روزے رکھو[1]

نوٹ: شک کے دن کا روزہ رکھنا درست نہیں (شک سے مراد یہ ہے کہ کوئی یہ سمجھ کر روزہ رکھے کہ چلو اگر آج یکم رمضان نہ ہوا تو میرا نفلی روزہ ورنہ رمضان کا پہلا فرضی روزہ ہو جائے گا) حدیث میں ہے ''جس نے شک کے دن روزہ رکھا اس نے ابو القاسم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی''[2]

اسی طرح استقبال رمضان کے نام سے رمضان سے ایک دو دن قبل روزہ رکھنا بھی درست نہیں ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''لاتتقدموا صوم رمضان بيوم أو يومين إلا أن يكون صوم يصومه رجل فليصم ذلك اليوم۔''[3]

''رمضان سے ایک دو دن پہلے روزہ نہ رکھو ہاں مگر ایسا دن ہو جس میں کوئی پہلے سے روزہ رکھتا رہتا ہے (مثلا سوموار، جمعرات کے دن) تو وہ رکھ سکتا ہے۔''

---

[1] صحیح بخاری:1909، صحیح مسلم:108

[2] سنن ابی داؤد:2336

[3] صحیح بخاری:1914، صحیح مسلم:1082، مسند احمد:7722

5 روزے کا آغاز

’’فجرِ ثانی‘‘ جسے صبح صادق بھی کہتے ہیں کے طلوع ہوتے ہی روزے کا آغاز ہوجاتا ہے اور اختتام غروب آفتاب کے ساتھ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ (سورہ البقرہ:187)

’’اور کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ صبح کا سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے ظاہر ہوجائے، پھر رات تک روزے کو مکمل کرو۔‘‘

اس آیت میں ’’الخيط الأبيض‘‘ اور ’’الخيط الأسود‘‘ سے مراد صبح کے اجالے کا رات کی تاریکی سے الگ ہونا ہے۔

6 سحری کرنا

یہ وقت نہایت برکت والا ہے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے نوافل، اذکار، دعا وغیرہ میں صرف کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس وقت آسمانِ دنیا پہ نزول فرماتا ہے۔

شریعت نے سحری کھانے کی ترغیب دی ہے اور اس کھانے کو بابرکت قرار دیا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ’’تسحروا فإن فی السحور برکة‘‘[1] سحری کیا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔

ایک روایت میں اسے یہود کی مخالفت قرار دیا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

’’إن فصل ما بين صيامنا وصيام أهل الكتاب أكلة السحور۔‘‘[2]

’’ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں یہ فرق ہے کہ وہ سحری نہیں کرتے‘‘۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں تاخیر کی ترغیب دلائی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سحری اور اذان میں جو وقفہ ہوتا تھا وہ پچاس آیتوں کے بقدر ہوتا تھا اس وقفہ کو شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ نے چھ منٹ کے برابر

---

[1] صحیح بخاری:1923، صحیح مسلم:2524

[2] سنن نسائی:2166

قرار دیا ہے۔[1]

اگر کوئی شخص تاخیر سے بیدار ہوا اسے جنابت کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے تو پہلے وہ سحری کرے بعد میں طلوع فجر کے بعد غسل جنابت کر لے۔[2]

اگر کوئی شخص طلوع فجر کے بعد بیدار ہوا ہے تو وہ کھائے پیئے بغیر روزہ رکھ لے کیونکہ سحری کا وقت ختم ہو چکا ہے، اور اگر دوران کھانا اذانِ فجر شروع ہو جائے تو وہ اپنا کھانا پورا کرے جیسا کہ حدیث میں ہے:

" إذاسمع أحدكم النداء والإناء على يده فلايضعه حتى يقضي حاجته منه"[3]۔

"جب تم میں سے کوئی فجر کی اذان سنے اور کھانے کا برتن اس کے ہاتھ میں ہو تو وہ اس برتن کو اس وقت تک نہ چھوڑے جب تک وہ اپنے کھانے کی حاجت پوری نہ کر لے"۔

سحری میں کھجور کو شامل کرنا اچھا ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بہترین کھانا قرار دیا ہے

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: "نعم سحورالمؤمن التمر "[4] "مؤمن کی بہترین سحری کھجور ہے"۔

7 افطاری کا بہترین وقت

غروب آفتاب ہوتے ہی روزہ افطار کر لینا چاہیے، اس میں احتیاطی تاخیر درست نہیں ہے (جیسا کہ کچھ لوگوں کی عادت ہے کہ احتیاطی طور پہ ایک دو منٹ تاخیر سے روزہ افطار کرتے ہیں) حدیث میں ہے:

" لايزال الناس بخيرماعجلواالفطر۔"[5]

"لوگ اس وقت تک خیر پر رہیں گے جب تک وہ روزہ کے افطار میں جلدی کرتے رہیں گے۔"

ایک حدیث قدسی میں ہے: "إنَّ أحبَّ عبادي إليّ أعجلهم فطرا۔"[6]

[1] تنبيه الأفهام بشرح عمدة الأحكام، صفحه:463'حاشيه'

[2] صحيح مسلم:1109،سنن ابی داؤد:2390

[3] سنن ابی داؤد:2350

[4] سنن ابی داؤد:2345،ابن حبان:3475

[5] صحيح بخاری :1957،صحيح مسلم :2549

[6] سنن ترمذی،کتاب الصوم،باب ماجاءفی تعجيل الافطار،حديث:704۔

''میرے نزدیک میرے وہ بندے زیادہ محبوب ہیں جو روزہ افطار میں جلدی کرتے ہیں''
(یعنی غروبِ آفتاب ہوتے ہی افطار کر لیتے ہیں)۔

تازہ تر کھجور سے روزہ افطار کیا جائے اگر وہ بھی میسر نہ ہو تو پانی کے چند گھونٹ پی کر بھی روزہ افطار کیا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ افطار پہ دسترخوان پہ بیٹھے مسلسل کھانے پینے میں مشغول رہ کر نماز مغرب کو ضائع کر دیتے ہیں، یہ نہایت قبیح عمل ہے اس سے اجتناب کرنا چاہیے کچھ کھا پی کر نماز کو باجماعت ادا کیا جائے باقی نماز کے بعد آ کر کھا پینا کیا جائے تا کہ فرض نماز ضائع نہ ہو۔

اگر کوئی یہ سمجھ کر کہ سورج غروب ہو گیا اور روزہ افطار کر لے تو پھر بعد میں علم ہوا کہ سورج غروب نہیں ہوا تھا تو اس پر کوئی قضا نہیں ہے جیسا کہ اللہ پاک کا فرمان ہے:

﴿وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ﴾[سورة الاحزاب:5]

''تم سے بھول چوک میں جو کچھ ہو جائے اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں البتہ جس کا تم دل سے ارادہ کرو۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی میں ایسا واقعہ پیش آیا تھا (مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے وہ سمجھے کہ سورج غروب ہو گیا ہے اور روزہ افطار کر لیا) آپ نے انہیں روزہ کے قضا کا حکم نہیں دیا،[1] اسی طرح کا واقعہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی پیش آیا تھا آپ نے بھی قضا کا حکم نہیں دیا[2]۔

افطار کے وقت دعائیں کرنا یہ بہت اچھا عمل ہے بلکہ وہ وقت تو دعاؤں کی قبولیت کا ہوتا ہے اس موقع پر کثرت سے دعا کا اہتمام کرنا چاہیے جیسا کہ حدیث میں ہے:

''إن للصائم عندفطره دعوة ماترد''[3]۔ ''روزہ دار کی افطار کے وقت کی دعائیں رد نہیں ہوتیں''۔

افطار کے وقت یہ دعا پڑھی جائے:

''ذهب الظمأوابتلت العروق وثبت الأجر إن شاءالله''[4]

---

[1] صحيح بخاری حديث: 1959
[2] مصنف عبدالرزاق حدیث: 7392۔ مؤطا امام مالک حدیث: 365
[3] سنن ابن ماجه: 1753
[4] سنن ابی داؤد: 2357

”پیاس ختم ہوگئی رگیں تر ہوئیں اور اللہ نے چاہا تو اجر ثابت ہوگیا۔“

8 روزہ کو فاسد کرنے والے چند امور

ایسے کچھ امور ہیں جن کے ارتکاب سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے، روزہ دار کے لیے ان امور سے باخبر رہنا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ ان امور سے بچ سکے اور اپنے روزہ کی حفاظت کر سکے، وہ امور درج ذیل ہیں:

1 **جماع**، بحالت روزہ اگر بیوی سے ہمبستری کے فعل کا مرتکب ہوا تو اس کا روزہ باطل ہوجائے گا، اور اس روزہ کی قضا کے ساتھ کفارہ بھی واجب ہوگا، کفارہ یہ ہے: ایک غلام آزاد کرنا، اگر غلام یا اس کی قیمت کی طاقت نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل پے در پے روزے رکھنا اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مساکین کو کھانا کھلائے اس کی صورت یہ ہے کہ ہر مسکین کو آدھا صاع (تقریبا سوا کلو) کھانا کھلائے (جو کھانا اس کے اپنے علاقے میں معروف ومتداول ہے)۔ یہ کفارہ بیوی پر لاگو نہیں ہوگا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کو جس نے اپنی بیوی کے ساتھ روزہ کی حالت میں جماع کیا تھا، کفارہ کا حکم دیا اس کی بیوی سے کچھ بھی نہیں کہا۔

2 **انزال منی**: جماع کے علاوہ کسی بھی طریقے (بیوی کا بوسہ لینے، یا اس کو شہوتاً چھونے) سے انزال منی ہوجائے تو روزہ فاسد ہوجائے گا اس صورت میں روزہ کی قضا دینا ہوگی کفارہ نہیں ہے، البتہ سوئے ہوئے شخص کو روزہ کی حالت میں احتلام ہوجائے تو اس کا روزہ صحیح ہے کیونکہ یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے لیکن غسل جنابت ضروری ہے۔

3 **جان بوجھ کر کھانا پینا**: قصداً کھانے پینے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس صورت میں اسے اس روزہ کی قضا دینا ہوگی۔ اگر وہ بھول کر کھا پی لیتا ہے اس سے اس کے روزے پر کوئی اثر نہیں ہوگا اس کا روزہ درست ہوگا جیسا کہ حدیث میں ہے:

”من نسی وهوصائم فأكل وشرب فليتم صومه فإنما أطعمه الله وسقاه“ [1]

”جس نے بھولے سے کھا پی لیا وہ اپنا روزہ مکمل کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے کھلایا پلایا ہے“۔

---

[1] صحیح بخاری: 6669، صحیح مسلم: 2709۔

❹ **جان بوجھ کر قے کرنا:** اس سے بھی روزہ فاسد ہوجاتا ہے۔اس کی صورت یہ ہے کہ معدے میں موجود کھانے کو منہ کے راستے جان بوجھ کر باہر نکالنا، ایسا کرنے والا روزہ کی قضادے گا جیسا کہ حدیث میں ہے:''من استقاء عمداً فليقض۔''[1]

''جان بوجھ کر قے کرنے والا اپنے روزے کی قضا دے''۔

البتہ بے اختیار ازخود قے ہوجائے تو اس سے روزہ کی صحت پر اثر نہیں پڑے گا جیسا کہ حدیث میں ہے:

''من ذرعه القئی فليس عليه قضاء۔''[2]

''جس پر قے کے غلبے کی وجہ سے ازخود قے ہوجائے تو اس پر کوئی قضا نہیں ہے۔''

❺ **حجامہ سینگی لگوانے سے بھی روزہ فاسد ہوجاتا ہے۔** جیسا کہ حدیث میں ہے:

'' أفطر الحاجم والمحجوم۔''[3]

''سینگی لگانے والے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا''

اس حکم میں وہ بھی داخل ہے جو کسی کو خون عطیہ کرتا ہے، البتہ لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے معمولی مقدار میں خون دینے والا اس حکم میں شامل نہیں ہے، اسی طرح بے اختیار (نکسیر، زخم سے یا دانت نکلوانے سے) خون نکلے تو وہ روزہ کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوں گے، حلق کی بجائے بذریعہ رگ پیٹ میں غذا پہنچے یا طاقت کا انجیکشن لینے سے روزہ ٹوٹ جائے گا، اگر طاقت کے انجیکشن کی بجائے عام انجیکشن بحالت روزہ لگوائے تو احتیاط اسی میں ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے، کیونکہ یہ شک میں مبتلا کررہا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

''دع ما يريبک إلى ما لا يريبک''[4]

---

[1] سنن ابی داؤد:2380،سنن ترمذی:720۔

[2] سنن ابی داؤد:2380،سنن ترمذی:720۔

[3] سنن ابی داؤد:2369،سنن دارمی:1730۔

[4] سنن ترمذی:2523،سنن نسائی:5727۔

ایسی حالت میں اگر روزہ دار اسے رات تک مؤخر کردے تو اچھا ہے لیکن اگر شدتِ مرض غالب ہے اور جان کے جانے کا خدشہ ہے تو شریعت کی عطا کردہ رخصت پر عمل کرے یعنی روزہ چھوڑ دے بعد میں اس کی قضا دے دے۔

6 **حیض ونفاس:** یہ بھی روزہ کو ختم کردیتے ہیں، چاہے یہ خون فجر کے بعد شروع دن میں آئے یا مغرب سے کچھ لمحے پہلے آئے، اس صورت میں عورت روزہ نہیں رکھے گی بعد میں ان روزوں کو رکھے گی۔

درج ذیل امور زورہ دار کے لیے جائز ہیں:

❋ روزہ کی حالت میں مذی خارج ہو، یا احتلام ہو جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''روزہ کسی چیز کے جسم میں داخل ہونے سے ٹوٹتا ہے، جسم سے خارج ہونے سے نہیں ٹوٹتا۔''[1]

حالت روزہ میں سر پر تیل لگانا اور کنگھی کرنا جائز ہے۔[2]

❋ روزہ دار کے لیے سرمہ استعمال کرنا جائز ہے۔[3]

حالت جنابت میں سحری کھا کر روزہ رکھ لینا اور بعد میں غسل کرنا جائز ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ بعض دفعہ فجر ہو جاتی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی کسی بیوی کے ساتھ صحبت کی وجہ سے جنبی ہوتے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غسل فرماتے ہیں اور آپ روزے سے ہوتے تھے۔[4]

❋ بحالت روزہ ناک، کان میں ایسی دوا کے ڈالنے سے اجتناب کرے جس کا اثر حلق میں محسوس ہو، یا دوا کے حلق میں جانے کا اندیشہ ہو، امام حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ناک میں دوا (وغیرہ) ڈالنے

---

[1] صحیح بخاری، : 1938۔

[2] صحیح بخاری: 1930۔

[3] سنن ابی داؤد: 2379۔

[4] صحیح بخاری:1925،1926، صحیح مسلم:1109،1110

میں، اگر وہ حلق تک نہ پہنچے تو کوئی حرج نہیں ہے۔① بحالت روزہ دورانِ وضو کلی کرتے وقت اور ناک میں پانی ڈالتے وقت مبالغہ نہ کرے اس سے پیٹ میں پانی کے چلے جانے کا خدشہ ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

"وبالغ فی الاستنشاق إلاأن تکون صائما" ②

''ناک میں خوب اچھی طرح پانی چڑھاؤالا یہ کہ تم روزے سے ہو۔''

❁ بحالت روزہ تھوک نگلنے، بالوں میں تیل ڈالنے، غسل کرنے (آج کل رمضان گرمی کے موسم میں آرہا ہے اس لیے اگر کوئی شخص گرمی یا پیاس کی وجہ سے سر پر پانی ڈالنا یا نہانا چاہتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے، اس پر ممانعت کی کوئی دلیل نہیں۔③ امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ گرمی کی وجہ سے کپڑا بھگو کر اپنے چہرے پر ڈالنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔④ ❁ بخور لینے خوشبو سونگھنے سے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، عورت کھانا پکانے کے دوران نمک وغیرہ معمولی چکھ سکتی ہے بشرطیکہ اسے نہ نگلے، بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اس کے جواز کا فتویٰ منقول ہے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: اس میں کوئی حرج نہیں⑤ ❁ مسواک خواہ دن کے شروع میں کی جائے یا آخر میں اس سے روزہ پر فرق نہیں پڑتا⑥ ❁ غبار، مکھی وغیرہ کے حلق میں جانے سے بھی کچھ نہیں ہوتا، روزہ دار غیبت، جھوٹ، چغلی، گالم گلوچ سے مکمل اجتناب کرے، اپنے ان لمحات کو قیمتی جانتے ہوئے ذکر واذکار و تلاوتِ قرآن میں صرف کرے، اگر ان امور سے خود کو نہ بچا سکا تو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے:

---

①صحیح بخاری: 1934

②سنن ابی داؤد: 142، سنن نسائی: 87۔

③صحیح بخاری: 1925، صحیح مسلم: 1109، سنن ابی داؤد: 2365۔

④مصنف ابن ابی شیبہ: 9214۔

⑤صحیح بخاری: 1930۔

⑥ارواء الغلیل: 16/1، صحیح بخاری: 1934

”من لم يدع قول الزوروالعمل به فليس لله حاجة فى أن يدع طعامه وشرابه۔“[1]

”جوروزہ کی حالت میں قول زوراورعمل زور سے اجتناب نہیں کرتااس کے بھوکے پیاسے رہنے کی اللہ کوکوئی حاجت نہیں۔“

روزہ دارکو چاہیے کہ رمضان کی راتوں میں قیام اللیل کااہتمام کرے بلکہ امام کے ساتھ قیام کرے اوراس کے ساتھ ہی فارغ ہوکراپنے گھرکولوٹے جیسا کہ حدیث میں ہے:

”إنه من قام مع الإمام حتىٰ ينصرف كتب له قيام ليلة۔“ [2]

”جوشخص امام کے ساتھ (نماز سے) فارغ ہونے تک قیام کرتاہے تواس کے لیے پوری رات (کےثواب) کا قیام لکھ دیا جاتا ہے۔“

9 **روزہ کے قضا سے متعلق چنداحکام:** رمضان کے روزے رہ جانے کے چنداسباب ہوتے ہیں جیساکہ سفر،مرض وغیرہ یاغیرشرعی عذرجیسا کہ روزہ کی حالت میں مجامعت کرناہردوصورتوں میں قضاواجب ہے،روزوں کی قضاجلدی دیناچاہیے،کسی عذرکی وجہ سے تاخیرکی بھی گنجائش ہے،قضا کے روزے مسلسل یاوقفوں سے بھی رکھ سکتاہے،اس قدرتاخیرنہ ہوکہ اگلارمضان بھی آجائے،ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے ذمہ رمضان کے قضاروزے ہوتے تھےجومیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سےنہیں رکھ پاتی تواگلے رمضان سے پہلے شعبان میں انہیں رکھ لیتی“[3]

اس سے معلوم ہواکہ قضاکے وقت میں تنگی نہیں بلکہ وسعت ہے،اگروسیع وقت بھی گزرگیاتورمضان کے بعدفوراًان کی قضاکی فکرکرےاس میں سُستی نہ کرے۔

10 **بڑی عمرکے بوڑھے اورناقابل شفابیماروں کے روزوں کاحکم:** جولوگ اس ماہ کو پالیں وہ روزہ رکھیں گےاورجوکسی شرعی عذرکی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے وہ قضاکریں گےایک تیسری قسم ان ضعیف

---

[1] صحیح بخاری:1903

[2] سنن ترمذی:806

[3] صحیح بخاری:1950،صحیح مسلم:2682

وناتواں لوگوں کی ہے جو نہ روزہ رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی قضا کرسکتے ہیں ان کے لیے تخفیف کی گئی ہے جیسا کہ اللہ پاک کا فرمان ہے:

﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ﴾ (سورۃ البقرہ:184)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے وہ اپنے ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کو نصف صاع (625 گرام تقریباً) کھانا کھلائیں۔"[1] اس حکم میں وہ مریض بھی شامل ہے جس کے شفایاب ہونے کی امید نہ ہو، حاملہ، مرضعہ جنہیں اپنے شیرخوار بچوں کی صحت کے نقصان کا خدشہ ہے وہ بھی روزہ افطار کرلیں اور ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں یہ کھانا کھلانا روزہ نہ رکھنے کی وجہ سے ہے، بعد میں روزہ کی قضا دیں گی، اسی کو علامہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے مختلف صحابہ کرام سے نقل کیا ہے[2]۔

مسائل اعتکاف

یہ ایک مشروع اور مسنون عمل ہے اس کی فضیلت بھی حدیث میں آئی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

"من اعتكف يوماابتغاء وجه الله جعل الله بينه وبين النار ثلاث خنادق كل خندق أبعدمابين الخافقين"[3]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کیا کرتے تھے[4] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے رمضان میں اعتکاف کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد امہات المؤمنین نے مسجد میں اعتکاف کیا[5]

اعتکاف کی جگہ مسجد ہے اور یہ مسجد کی عبادت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] صحیح بخاری: 4505

[2] زادالمعاد 29/2

[3] معجم اوسط طبرانی 220/7، حدیث: 7326 (حدیث کی صحت میں کلام ہے)

[4] صحیح بخاری: 2025، صحیح مسلم: 1171

[5] صحیح بخاری: 2026، صحیح مسلم: 1172

﴿وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ (سورۃ البقرہ:187)

''عورت بھی مسجد میں اعتکاف کرے جیسا کہ امہات المؤمنین مسجد میں اعتکاف کرتی تھیں۔''[1]

اعتکاف کرنے والا اکیسویں کی رات کو مسجد میں آجائے اور فجر پڑھ کر اپنی اعتکاف کی جگہ میں داخل ہوجائے۔

یہ آخری عشرہ نہایت فضیلت کا حامل ہے اس میں اللہ پاک نے لیلۃ القدر کو رکھا ہے جس کی ''عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے'' (سورۃ القدر:3)

اس رات کے قیام کی فضیلت کا ذکر بھی حدیث میں آیا ہے:

''من قام ليلة القدر إيمانا واحتسابا غفرله ماتقدم من ذنبه۔'' [2]

جو شخص لیلۃ القدر کا قیام ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے کرے گا اس کے سارے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔

اور اس رات کے تلاش کی ترغیب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کو دی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

'' تحروا ليلة القدر فی الوترمن العشر الأواخرمن رمضان'' [3]

ترجمہ: ''رمضان کی آخری طاق راتوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس آخری عشرے میں یہی معمول ہوتا تھا جیسا کہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ

'' كان رسول ﷺ إذادخل العشر الأواخرمن رمضان أحياليله،وأيقظ أهله، وجدّ وشدّ مئزره۔''[4]

''جب رمضان کا آخری عشرہ آتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شب بیداری کرتے اپنے گھر والوں کو جگاتے خوب محنت کرتے اور کمر کس لیتے تھے''

---

[1] صحیح بخاری:2033، صحیح مسلم:1173

[2] صحیح بخاری:2008،صحیح مسلم:760

[3] صحیح بخاری:2020

[4] صحیح بخاری:7074،صحیح مسلم:1174

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بابرکت رات میں پڑھنے کے لیے یہ دعا سکھائی ہے:

" اللهم إنک عفو تحب العفو فاعف عني۔"[1]

''اے اللہ! بے شک تو معاف کرنے والا معافی کو پسند کرنے والا ہے مجھے معاف کردے''

ہمارے ہاں اس رات کے حوالے سے جتنے بھی غیر مسنون امور رائج ہیں ان سے اجتناب کرتے ہوئے ان مبارک ساعات کو قیمتی جانتے ہوئے انفرادی طور پر عبادات میں صرف کرنا چاہیے، نہ کہ ان اوقات کو کھانے پینے کے امور میں ضائع کرنا چاہیے۔

صدقۃ الفطر کے مسائل

یہ وہ صدقہ ہے جو رمضان المبارک کے اختتام پر ادا کیا جاتا ہے اس کی مشروعیت کی بہت سی حکمتیں ہیں، روزوں میں ہونے والی کمی کوتاہیوں کو دور کرتا ہے۔ فقرا مساکین کی عید کی خوشیوں کا سبب بنتا ہے روزوں کے اختتام پر اللہ پاک کے شکر کا اظہار ہے۔

صدقۃ الفطر فرض ہے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر مسلمان آزاد، غلام، مرد، عورت ہر چھوٹے بڑے پر فرض قرار دیا ہے جو کہ ایک صاع کھجوروں گندم یا جو وغیرہ سے ادا کیا جاتا ہے۔[2]

ایک صاع تقریبا اڑھائی کلو بنتا ہے، جنس سے ادا کرنا زیادہ افضل ہے جیسا کہ محولہ بالا حدیث میں مذکور ہے۔

اس کے ادا کرنے کا وقت عید کی رات غروبِ آفتاب سے لے کر عید کی نماز کی ادائیگی سے پہلے پہلے ہے، ایک دو دن پہلے بھی ادا کیا جاسکتا ہے جیسا کہ بعض صحابہ کا اس بارے میں عمل ملتا ہے۔[3]

اگر عید کی نماز سے پہلے ادا کرنا ممکن نہ رہا تو نماز کے بعد قضا کے طور پر ادا کرنا واجب ہوگا جیسا کہ حدیث میں ہے:

---

[1] سنن ترمذی: 3513

[2] صحیح بخاری: 1503، صحیح مسلم: 2275

[3] صحیح بخاری: 1511

”من أداها قبل الصلاة فهي زكوة مقبولة ومن أداها بعدالصلاة فهي صدقة من الصدقات“[1]

جونماز سے پہلے ادا کرے گا وہ مقبول صدقہ ہے اور نماز کے بعد ادا کرے گا وہ عام صدقہ ہوگا، خاندان کا سربراہ اپنے زیر کفالت لوگوں کا صدقۃ الفطر ادا کرے گا جیسا کہ حدیث میں ہے:

”أدوا الفطرة عمن تمونون۔“ [2] جوتمہارے زیر کفالت ہیں ان کی طرف سے صدقۃ الفطر ادا کرو۔

نمازِ عید کے مسائل

عید کے دِن روزہ: ”نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا“[3]۔

عید کے دِن کھانا: عید الفطر کے روز کچھ کھا کر نماز کے لیے جانا اور عید الاضحیٰ سے پہلے کچھ نہ کھانا مسنون ہے۔

نمازِ عید عیدگاہ میں ادا کرنا سنت ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عیدین کے موقع پر عیدگاہ میں تشریف لے جاتے اور نمازِ عید ادا فرماتے[4]

شرعی عذر: اگر عید کے دن بارش ہوجائے تو مسجد میں نمازِ عید ادا کی جاسکتی ہے، جیسا کہ سیدنا عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما نے اپنے دورِ خلافت میں بارش کی وجہ سے مسجد میں عید کی نماز پڑھائی[5]۔

مستورات کا عیدگاہ میں جانا: اُمِ عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، ہمیں دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حکم ہوا کہ ہم حائضہ اور پردہ نشین مستورات کو بھی عیدین میں (اپنے ہمراہ) لے کر جائیں تاکہ وہ مسلمانوں کی دُعا اور خیر میں شامل ہوجائیں، لیکن حائضہ عورتیں نماز کی جگہ سے علیحدہ رہیں۔ ایک خاتون نے عرض کیا۔: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! بعض دفعہ کسی کے پاس چادر نہیں ہوتی فرمایا اس کی سہیلی اپنی چادر

---

[1] سنن ابی داؤد: 1609

[2] سنن دارمی: 2059

[3] صحیح بخاری: 1990، صحیح مسلم: 1137

[4] صحیح بخاری: 973

[5] محلیٰ ابن حزم 128/5

اسے اوڑھا چھپا کر لے آئے“[1]۔

عیدگاہ کو پیدل آنا جانا اور آتے جاتے راستہ تبدیل کرنا سنت ہے[2]۔

نمازِ عید کا طریقہ: نمازِ عید خطبہ سے پہلے صرف دو رکعت ہے، اس میں نہ اذان ہے اور نہ اقامت (تکبیر) ہے۔[3]

تکبیراتِ عیدین

نمازِ عید دو رکعت ہے، پہلی رکعت میں قرات سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں قرأت سے پہلے کہے اور ہر تکبیر کے ساتھ دونوں ہاتھ اُٹھائے۔[4] پہلے نماز پڑھی جائے گی۔ اس کے بعد خطبہ سنا جائے گا۔

قرأت نمازِ عیدین

آپ ﷺ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد ﴿سبح اسم ربك الأعلى﴾ اور دوسری میں ﴿هل أتاك حديث الغاشية﴾ پڑھتے[5] اور کبھی سورۂ ق اور سورۂ قمر بھی پڑھتے۔[6]

مبارک بادی: نمازِ عید کے بعد مسلمان آپس میں ملاقات کریں تو ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد ان الفاظ میں دیں: تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ مِنْكَ[7]۔ ”اللہ پاک ہم سے اور آپ سے (عبادت کو) قبول فرمائے۔“

شوال کے چھے روزے: رمضان کے بعد شوال کے چھے روزوں کی فضیلت احادیث میں آئی

---

[1] صحیح بخاری: 324، صحیح مسلم: 2091

[2] صحیح بخاری: 986

[3] صحیح مسلم: 887

[4] مسند احمد: 6688

[5] صحیح مسلم: 878

[6] صحیح مسلم: 891

[7] مجمع الزوائد 2/206

ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

”من صام رمضان ثم أتبعه ستا من شوال فذاک صیام الدھر “ [1]

”جس نے رمضان کے روزوں کے بعد شوال کے چھے روزے رکھے یہ زمانے بھر کے روزوں کی مانند ہیں۔“

یہ روزے عید کے بعد مسلسل یا وقفوں سے جس طرح سہولت ہو رکھ سکتا ہے، ماہ شوال میں ان کو پورا کرنا ضروری ہے اگر کسی کے ذمے قضا کے روزے ہیں تو پہلے انہیں رکھے پھر شوال کے رکھ لے یہ بہتر ہے۔

والله اعلم بالصواب

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

[1] صحیح مسلم :1164،سنن ابی داؤد:2433،سنن ترمذی:759

بروکری کی اسلام میں شرعی حیثیت

خالد حسین گورایہ (1)

الحمدللہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ وعلیٰ آلہ وصحبہ ومن والاہ ۔ وبعد

جیسے جیسے دنیا بدلی ہے لوگوں کا طرز تعامل وطریقہ ہائے تجارت بھی بدل گئے ہیں ہر آئے دن نت نئ شکلوں اور صورتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور لوگ اس امر کے محتاج ہوتے ہیں کہ انہیں ان پیش آمدہ مسائل کی بابت شرعی حکم سے آگاہ کیا جائے تا کہ وہ اپنی تجارت کو دائرہ حلال تک محدود رکھیں اور حتی الامکان دائرہ حرام سے بچ کر رہیں۔

بروکری کا پیشہ یوں تو ایک قدیم پیشہ ہے لیکن فی زمانہ کاروبار کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اور اس کی بہت سی نئ صورتیں بھی سامنے آئی ہیں۔ پراپرٹی کے کاروبار سبزی منڈی فروٹ منڈی کی خرید وفروخت اور سٹاک مارکیٹ اور کموڈیٹی ایکسچینج میں بروکر کے بغیر خرید وفروخت کا تصور بھی محال ہے۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ بروکری سے متعلقہ جملہ مسائل کا جائزہ لیکر ان کی شرعی حیثیت کو بیان کیا جائے تا کہ نبی پاک ﷺ کے اس فرمان کے تابع ہو کر زندگی گذاری جا سکے کہ

”إِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ، والْحَرَامَ بَيِّنٌ، وبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ، وعِرْضِهِ، ومَنْ وقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وقَعَ فِي الْحَرَامِ، كَالرَّاعِي يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى، يُوشِكُ أَنْ يَقَعَ فِيهِ، أَلَا وإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، أَلَا وإِنَّ حِمَى اللَّهِ مَحَارِمُهُ، أَلَا وإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وإِذَا

(1) نائب مدیر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

فَسَدَتْ فَسَدَ الجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وهِيَ القَلْبُ"[1]

ترجمہ: "بیشک حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہات ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے پس جو شبہ میں ڈالنے والی چیز سے بچا اس نے اپنے دین اور عزت کو محفوظ کرلیا اور جو شبہ ڈالنے والی چیزوں میں پڑ گیا تو وہ حرام میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو کسی دوسرے کی چراگاہ کے اردگرد چراتا ہے، تو قریب ہے کہ جانور اس چراگاہ میں سے بھی چر لیں خبردار رہو ہر بادشاہ کے لئے چراگاہ کی حد ہوتی ہے اور اللہ کی چراگاہ کی حد اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں آگاہ رہو جسم میں ایک لوتھڑا ہے جب وہ سنور گیا تو سارا بدن سنور گیا اور جب وہ بگڑ گیا تو سارا ہی بدن بگڑ گیا آگاہ رہو کہ وہ دل ہے۔"

تو باب متشابہات کی معرفت بہت ضروری ہے کہ اس سے بچا جائے تاکہ حرام میں ملوث ہونے سے بچا جاسکے۔

بروکری کیا ہے؟

بروکری کو عربی زبان میں "السمسرة" کہا جاتا ہے۔

شرعی اصطلاح میں الموسوعہ الفقہیہ کے مطابق بروکری کی یہ تعریف منقول ہے:

"هي التوسط بين البائع والمشتري، والسمسار هو: الذي يدخل بين البائع والمشتري متوسطاً لإمضاء البيعِ، وهو المسمى الدلال، لأنه يدل المشتري على السلع ، ويدل البائع على الأثمان"[2]

خریدار اور فروخت کنندہ کے مابین واسطہ بننا بروکری کہلاتا ہے۔ سمسار وہ ہے جو خریدار اور بیچنے والے کے درمیان واسطہ بنتے ہوئے سودا مکمل کرواتا ہے، اسے عرف عام میں "دلال" بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ خریدار کی سودے کیلئے اور بیچنے والے کی قیمت کے حوالے سے رہنمائی کرتا ہے۔

---

[1] صحیح البخاری، حدیث :52، صحیح مسلم :1599

[2] الموسوعة الفقهية :151/10

مختلف شعبہ ہائے کاروبار میں بروکری کیلئے استعمال کئے جانے والے نام:

1. آڑھتی (سبزی فروٹ اور غلہ منڈی کے بروکر)
2. دلال (مویشی منڈی کے بروکر)
3. ڈیلر (پراپرٹی کاروبار میں)
4. جبکہ بروکر سٹاک اور کموڈیٹی ایکسچینج میں واسطہ بننے والے کو کہا جاتا ہے۔[1]

بروکری کا شرعی حکم

بنیادی طور پر دین اسلام میں بروکری اور کمیشن ایجنٹ کے طور پر کام کرنے کی کوئی ممانعت نہیں بلکہ متعدد نصوص سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد کی روایت میں ہے قیس بن ابی غرزۃ فرماتے ہیں:

''كنَّا نسمَّى في عَهدِ رسولِ اللهِ صلَّى الله عليهِ وسلَّمَ السَّماسِرةَ فمرَّ بنا رسولُ اللَّهِ ﷺ فسمَّانا باسمٍ هوَ أحسنُ منهُ فقالَ يا معشرَ التُّجَّارِ إنَّ البيعَ يحضرُهُ الحلِفُ واللَّغوُ فشوبوهُ بالصَّدقةِ''۔[2]

''عہد رسالت میں ہم لوگوں (سوداگروں) کو سماسرہ (یعنی دلال) کہا جاتا تھا۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے پاس تشریف لائے تو آپ نے ہمارا پہلے سے بہتر نام تجویز فرمایا۔ (آپ نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا) اے تاجرو! تجارت میں بیکار باتیں اور قسما قسمی ہوتی ہے لہٰذا اپنی تجارت کو صدقہ کے ساتھ ملاؤ۔''

اور صحیح بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں:

'' نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يُتَلَقَّى الرُّكْبَانُ وَلَا يَبِيعَ حَاضِرٌ لِبَادٍ قُلْتُ

---

[1] معیشت وتجارت کے اسلامی احکام ملخصاً ص۔115

[2] سنن ابي داؤد : كتاب البيوع ، باب في التجارة يخالطها الحلف واللغو

يَا ابْنَ عَبَّاسٍ مَا قَوْلُهُ لَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ قَالَ لَا يَكُونُ لَهُ سِمْسَارًا“ [1]

”رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قافلہ والوں سے آگے جا کر نہ ملو اور شہری دیہاتی کے لئے بیع نہ کرے، طاؤس کا بیان ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا، شہری دیہاتی کے لئے نہ بیچے، اس کا کیا مطلب ہے، انہوں نے جواب دیا کہ دلالی نہ کرے“۔

فقیہ امت امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر کمیشن کے جواز کا عنوان قائم کیا ہے اور ان لوگوں کی تردید کی ہے جو اس کو جائز نہیں سمجھتے۔ [2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

” فان مفهومه: أنه يجوز أن يكون سمسارا في بيع الحاضر للحاضر“[3]

”اس روایت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شہری شخص کسی دوسرے شہری کا ایجنٹ اور دلال بن سکتا ہے“۔

یہاں مراد یہ ہے کہ امام بخاری حافظ ابن حجر و دیگر فقہاء کرام اس حدیث سے یہ استدلال لیتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کمیشن پر لین دین کی صرف ایک خاص صورت سے روکا ہے۔ اور وہ یہ کہ شہری صحراء نشینوں کو کمیشن پر خرید وفروخت کرائے۔ کیونکہ اس طرح کے لوگ انتہائی ضرورت کے تحت اور محدود پیمانے پر خرید وفروخت کرتے ہیں جس سے ایسے لوگوں سے کمیشن وصول کرنے میں ظلم کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اسی بنا پر شرعاً شہری لوگوں کو ایسے دیہاتیوں اور صحراء نشینوں کو کمیشن پر لین دینے کرنے سے روکا ہے۔

البتہ جو بعض تابعین سے کمیشن پر خرید وفروخت کے حوالے سے کراہت منقول ہے وہ کمیشن کی چند مخصوص صورتیں ہیں جن میں فقہاء کرام کے ہاں اختلاف ہے۔ ان روایات میں سے ایک روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں حماد کے حوالے سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں: ”وہ کمیشن کی اجرت کو مکروہ سمجھتے تھے الا کہ اس کی مدت معلوم ہو“۔ [4]

---

[1] صحيح البخاري : كتاب الإجارات ، باب أجر السمسرة

[2] معیشت وتجارت کے اسلامی احکام از حافظ ذوالفقار طاہر علی: ص 119

[3] فتح الباري :(452/4)

[4] مصنف ابن ابی شيبه، كتاب البيوع والأقضية ، باب أجر السمسار(2105)

توحماد کا کمیشن کی اجرت کومکروہ سمجھنا اس وجہ سے تھا کہ ایسا کمیشن جس کی مدت مجہول ہو وہ مکروہ ہے نہ کہ وہ اصل کمیشن کی اجرت کومکروہ سمجھتے تھے۔اسی معنیٰ ومفہوم میں امام سفیان سے کراہت منقول ہے چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں سفیان سے منقول ہے کہ ’’کمیشن ایجنٹ کے کام کومکروہ جانتے تھے‘‘۔[1]

امام ابن سیرین رحمہ اللہ سے بھی ایک اثر منقول ہے کہ ’’آپ دلال کی اجرت کومکروہ جانتے تھے‘‘۔[2] جبکہ صحیح بخاری میں ابن سیرین سے کمیشن کی اجرت کا جواز منقول ہے۔

الغرض جن تابعین سے کمیشن ایجنٹ کی اجرت کی کراہیت کے آثار منقول ہیں اس کی دو ہی وجوہات ہیں وجہ اول کا بیان اوپر گذر چکا جبکہ دوسری وجہ اس سے مراد کراہت تنزیہ بھی ہوسکتی ہے کیونکہ کمیشن کے کاروبار میں لغو اور قسم کا استعمال بکثرت ہونا ہے۔(عین ممکن ہے اسی باعث وہ اس کی کراہت تنزیہ کے قائل ہوں)۔[3]

امام مالک رحمہ اللہ سے سمسار کی اجرت کا پوچھا گیا تو آپ فرمانے لگے:

’’لا بأس بذلك‘‘[4]

اورامام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے جس میں انہوں نے صحابہ وتابعین سے تعلیقا آثار نقل کئے ہیں کہ بروکری کا پیشہ اوراس کی اجرت جائز ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

’’باب اجر السَّمسرة،ولم یر ابن سیرین وعطاء وإبراهیم والحسن بأجر السِّمسار باسًا۔

وقال ابن عباس:لا باس أن یقول: بع هذا الثوب فما زاد علی کذا وکذا فهو لك۔‘‘

وقال ابن سیرین:إذا قال بعه بکذا فما کان من ربحٍ فهو لك،أو بیني وبینك فلا باس

[1] مصنف ابن أبي شیبة کتاب البیوع والأقضیة ، باب أجر السمسار:2109

[2] مصنف ابن أبي شیبة کتاب البیوع والأقضیة ، باب اجر الدلال:3276

[3] الوساطة التجاریة في المعاملات المالیة ص69

[4] المدونة 466/3

به،وقال النبي ﷺ:(المسلمون عند شروطهم)۔"[1]

بروکری کی اجرت کی بابت باب۔

ابن سیرین،عطاء ابراہیم اورحسن نے بروکری کی اجرت کے بارے میں کہا کہ کوئی حرج نہیں۔

اورابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ کوئی کسی کو کہے کہ:''یہ کپڑا بیچ دو اتنے سے زیادہ میں بکا تواس سے جوبھی زیادہ رقم ہے وہ تمہارے لیے ہے''۔

اورابن سیرین فرماتے ہیں:اگرکوئی یہ کہے کہ اسے اتنے میں بیچ دیں اس سے زائد جوبھی منافع ہواوہ آپ کا ہے یااس میں ہم دونوں شریک ہیں تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اورنبی ﷺ فرماتے ہیں:''مسلمان اپنی شرائط کے پابند ہوتے ہیں۔''

فقہی قاعدے سے استدلال

جواز کے دلائل میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ''معاملات میں اصل جواز اوراباحت ہے اورحرمت کیلئے دلیل درکار ہوتی ہے۔لہٰذا قرآن وحدیث میں کہیں بھی کمیشن پر اجرت کی ممانعت ثابت نہیں اس بنا پر یہ معاملہ جائز ہوا۔

سعودی عرب کی مستقل فتویٰ کمیٹی سے سوال کیا گیا کہ''ایک شخص ہے جس کا کمرشل آفس ہے وہ بعض کمپنیوں کی پروڈکٹ کی مارکیٹنگ کے لئے بحیثیت بروکر کام سرانجام دیتے ہیں۔وہ کمپنیاں اپنی تیار کردہ پروڈکٹ اسے ارسال کرتی ہیں وہ اسے بازار میں تاجروں کے سامنے پیش کرتا ہے اورانہیں کمپنی کی قیمت پر چیز فروخت کردیتا ہے کمپنی اسے اس کے عوض طے کردہ کمیشن دیتی ہے،کیاایسا کرنے میں کوئی گناہ ہے؟

فتویٰ کمیٹی نے جواب دیتے ہوئے لکھا: "إذا كان الواقع كما ذكر جاز لك أخذتلك العمولة، ولا إثم عليك۔"

اگرمعاملہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سوال میں بیان کیا ہے تو آپ کیلئے یہ کمیشن لینا جائز ہے اس میں آپ پر

---

[1] فتح الباري :451/4

کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں''۔ [1]

حاجت وضرورت کا قاعدہ

کمیشن کا کاروبار اس وجہ سے بھی جائز ہے کہ لوگوں کو اس کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو خرید وفروخت کے گُر نہیں جانتے، سودے بازی اور بھاؤ تاؤ کے طریقوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے پاس تجارت وکاروبار کیلئے فرصت نہیں ایسے حالات میں بروکری انسان کیلئے انتہائی سودمند ثابت ہوتی ہے۔ جس سے بیچنے والا اور خریدنے والا دونوں مستفید ہوسکتے ہیں علاوہ ازیں دیکھا گیا ہے آبادی کی وسعت کے باعث بیچنے والا یا خریدار اسی طرح کرائے پر مکان یا دوکان کے حصول کا خواہشمند شخص اصل مالک تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا جس کی وجہ اس سے شناسائی نہ ہونا اور یہ معلوم نہ ہونا کہ آیا کوئی اس علاقے میں اپنی جائیداد فروخت کرنے یا کرائے پر دینے کا خواہشمند بھی ہے یا نہیں لہٰذا ان ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے لازم ہوجاتا ہے کہ ایک دلال یا بروکر علاقے میں موجود ہو جہاں بائع اور مشتری دونوں رابطہ کرکے اپنی چیز بیچ اور خرید سکیں اور اپنی ضرورت کی جگہ کرائے وغیرہ پر حاصل کرسکیں۔ لہٰذا اگر محض اس ضرورت کو ہی مدنظر رکھ لیا جائے تو کمیشن کی اجرت کے جواز کے لئے کافی ہے ۔ کیونکہ معاملات کے باب میں شریعت سماحت اور نرمی وآسانی کو ملحوظ رکھتی ہے کہ جہاں لوگوں کی زندگی میں کسی معاملے کی وجہ سے حرج آرہا ہو تو شریعت اس میں استثناء اور جواز کی گنجائش پیدا کرتی ہے جیسا کہ بیع سلم، عقد استصناع، بیع عرایا وغیرہ میں بخوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ انہی دلائل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ بروکری کرنا یا دلال بننا اور کمیشن ایجنٹ کی حیثیت سے اجرت لینے میں کوئی ممانعت نہیں اور شرعاً ایک جائز پیشہ ہے۔ شریعت کے عمومی نصوص اس کے جواز پر دلالت کرتے ہیں۔

البتہ یہ بات ذہن نشیں رہے کہ جس طرح مسلمانوں میں دیگر معاملات میں بہت سی کمزوریاں اور بے راہ رویاں آچکی ہیں اسی طرح یہ پیشہ بھی ایک لحاظ سے مافیاز کے ہاتھوں یرغمال بن چکا ہے۔ جہاں حلال

[1] فتاوی اللجنة الدائمة:125/13

وحرام کے ضابطوں کی تمیز کیے بغیر محض متاع دنیا اور نفع عاجل کو مطمع نظر بناتے ہوئے شرعی حدود و قیود کو پامال کیا جاتا ہے۔ اور اس پیشے میں بھی کئی نئی ناجائز صورتیں در آئی ہیں جن کی ہم اللہ کی توفیق سے آئندہ سطور میں نشاندہی کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

بروکری کا کام کرنے والوں کیلئے شرعی اصول و ہدایات

جو بھی شخص کمیشن ایجنٹ اور بروکر کی حیثیت سے کام کرتا ہے اس کیلئے درج ذیل امور کا شرعاً لحاظ رکھنا لازمی ہے:

اول: جس معاملے میں وہ ایجنٹ کی حیثیت میں کام کر رہا ہے اسے اس کام کا ماہر اور تمام داؤ پیچ کا عالم ہونا چاہیے یہ نہ ہو کہ فریقین میں سے کسی ایک کو اس کی لاعلمی اور عدم مہارت کے باعث نقصان اٹھانا پڑے۔

دوم: بروکر صادق اور امین ہونا چاہیے ایسا نہ ہو کہ وہ ایک فریق سے زیادہ منافع اینٹھ کر دوسرے فریق کی کسی لحاظ سے طرفداری کرے یا اسے اضافی مالی فائدہ پہنچائے۔ بلکہ اسے چاہیئے کہ وہ چیز کی خامیاں وخوبیاں مکمل طور پر واضح کر کے بیان کردے۔

سوم: ہر قسم کی دھوکہ دہی سے چاہے وہ بائع کے ساتھ ہو یا خریدار کے اجتناب کرے۔

چہارم: کمیشن ایجنٹ اپنے کام سے قبل بائع یا مشتری جس کے لئے وہ بطور ایجنٹ کام کر رہا ہے اپنی اجرت طے کرلے کہ وہ کتنی ہوگی اور کس صورت میں ہوگی، تاکہ تنازعات سے بچا جا سکے۔ اور اپنی من مانی سے رقم لینے کی صورت میں وہ ایک دوسرے مسلمان بھائی کی رقم ناحق کھانے والا ہوگا جو کہ شریعت میں حرام عمل ہے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ﴾ (البقرۃ:188)

ترجمہ ''اور تم اپنے مال آپس میں باطل طریقوں سے ہڑپ نہ کرو''۔

پنجم: کسی بھی ایسے معاملے میں ایجنٹ نہ بنے جو کہ حرام ہو یا اس سے کسی حرام کام میں اعانت ہو رہی ہو۔ جیسے بینکوں کے کاروبار ہوں، سود پر مشتمل سودے ہوں، یا شراب، جوا، موسیقی کے آلات وغیرہ کے

سودے ہوں۔لہٰذا جہاں بھی ایجنٹ کو پتہ چل جائے کہ وہ جوسودا کروار ہاہے اس کا مقصد حرام اور وہ ظلم پر مبنی ہے تو ایسے کام میں کسی بھی طرح کی معاونت وسہولت کاری انجام نہ دے۔فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾(المائدۃ:2)

ترجمہ:''نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی امداد کرتے رہو اور گناہ ظلم زیادتی میں مدد نہ کرو''

ششم: کسی بھی بروکر کیلئے یہ روا نہیں کہ وہ خود غرض لالچی ہو جو محض اپنے مفاد کو سامنے رکھے۔ بلکہ اخلاقیات کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے۔کمیشن لینے میں،سودا کرانے میں عدل واخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ جہاں کچھ نرمی اور آسانی کا تقاضا ہو وہاں نرمی اور آسانی کا معاملہ کرے۔''

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

''رحم الله رجلاً سمحاً إذا باع وإذا اشترى وإذا اقتضى''[1]

''اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو فیاض ہو جب کہ بیچے اور جب خریدے اور جب اپنے حق کا تقاضا کرے''۔

حافظ ذوالفقار حفظہ اللہ اپنی کتاب معیشت وتجارت کے اسلامی احکام میں لکھتے ہیں:''کمیشن ایجنٹ کے لئے یہ از حد ضروری ہے کہ وہ قابل اعتماد اور صادق وامین ہونے کے ساتھ ساتھ اس شعبہ میں مکمل مہارت بھی رکھتا ہو کیونکہ لوگ انہی اوصاف کو مدنظر رکھ کر اپنی گراں قدر جائیدادوں کی خرید وفروخت کیلئے ان کی خدمات حاصل کرتے ہیں لہٰذا خریدار کو حقیقت حال سے آگاہ کرنا اور چیز کو اس کی مارکیٹ قیمت پر بیچنا کمیشن ایجنٹ کی بنیادی ذمہ داری ہے۔علاوہ ازیں حکومت وقت کا بھی فرض ہے کہ وہ ایسا ضابطہ اخلاق وضع کرے جس کی پابندی ہر کمیشن ایجنٹ پر لازم ہو اور ملک کے تمام کمیشن ایجنٹس کا پورا ریکارڈ حکومت کے پاس موجود ہو تا کہ جائیداد کی خرید وفروخت کے معاملات میں دھوکہ دہی کا سد باب کیا جاسکے اور فراڈ کی صورت میں ایجنٹ کو بھی قانون کی گرفت میں لایا جاسکے۔''[2]

---

[1] صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب السهولة والسماحة في الشراء والبيع

[2] معیشت وتجارت کے اسلامی احکام ص118

بروکری کی کچھ ناجائز صورتیں

کمیشن ایجنٹ کا کام اگر چہ شرعاً ایک جائز اور حلال پیشہ ہے لیکن فی زمانہ حلال وحرام سے ناواقفیت، خودغرضی اور لالچ جیسی صفاتِ مذمومہ کے نفوس میں استحکام کے بعد اس پیشے میں بھی متعدد ایسی صورتیں در آئی ہیں جو سراسر ناجائز اور غلط ہیں۔ ان امور میں جو شرائط ہم نے گزشتہ سطور میں ذکر کی ہیں ان میں اگر کسی شرط کے منافی عمل کیا جائے گا تو یقیناً وہ غیر شرعی صورت ہوگی لہذا ان شرائط کی پابندی کا لحاظ کیا جائے۔ البتہ کچھ مزید صورتیں ہیں جن سے چند ایک کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

اول: بیعانہ ضبط کرنا یا ڈبل کر کے واپس کرنا

پراپرٹی ودیگر کاروبار میں لوگوں میں یہ طریقہ رائج ہے، خریدار بیچنے والے کو بیعانہ ادا کرتا ہے اور بقیہ قیمت دینے کیلئے وقت لیتا ہے۔ اب اگر وہ مقررہ وقت پر قیمت ادا نہیں کرسکتا بائع اس کا بیعانہ ضبط کر لیتا ہے۔ اور اگر بائع اپنی چیز نہ بیچنا چاہ رہا ہو یا اسے کہیں سے اس سے اچھی قیمت مل رہی ہو تو وہ سودا منسوخ کر کے لیے ہوئے بیعانے کی رقم کو ڈبل کر کے خریدار کو واپس کر دیتا ہے۔

<u>یہاں مسئلہ مذکورہ کی دو صورتیں ہیں</u>۔ اول صورت یہ کہ: کیا بائع خریدار کے سودے سے پیچھے ہٹنے کی صورت میں اس کا دیا ہوا بیعانہ ضبط کرسکتا ہے یا نہیں۔؟ یہ صورت اہل علم کے ہاں مختلف فیہ رہی ہے۔ جمہور علماء کرام اس کے عدم جواز کے قائل ہیں جبکہ امام احمد ودیگر فقہائے حنابلہ امام ابن سیرین امام سعید بن مسیب اور عصر حاضر کے محقق علماء کرام اس کے جواز کے قائل ہیں جن میں علامہ ابن باز علامہ ابن عثیمین وغیرہ شامل ہیں۔

دوسری صورت یہ کہ: بائع کا خریدار کو بیعانہ ڈبل کر کے واپس دینا

یہ بات محل نظر ہے اور اکثر اہل علم اس کے عدم جواز کے قائل ہیں البتہ بعض علماء کرام نے حالات کے پیش نظر انتہائی محدود پیمانے پر اس کا بھی جواز دیا ہے۔ اس حوالے سے علامہ عبدالستار حماد حفظہ اللہ کا تفصیلی فتویٰ فتاویٰ اصحاب الحدیث میں منقول ہے قارئین کے فائدے کے لئے ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں۔

سوال:السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

خریدوفروخت کرتے وقت جب سودا طے کرلیا جاتا ہےتوخریدار،فروخت کنندہ کوکچھ رقم موقع پر ادا کر دیتا ہے تاکہ فروخت کنندہ اس چیز کوآگے فروخت نہ کرے،اس وقت فریقین یہ شرط طے کرتے ہیں کہ اگرخریدار نے بقیہ رقم ادا کر کے یہ چیز اپنے قبضہ میں نہ لی تو اس کی پیشگی ادا کردہ رقم ضبط کر لی جائے گی اور اگرفروخت کنندہ اس سے منحرف ہواتو اسے پیشگی رقم کا دوگنا ادا کرنا ہوگا،اس طرح جورقم پہلے ادا کی جاتی ہے اسے بیعانہ کہتے ہیں،اس خریدوفروخت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: الجواب بعون الوهاب بشرط صحة السؤال

وعلیکم السلام ورحمة اللہ وبرکاته!

الحمد لله، والصلاة والسلام علىٰ رسول الله، أما بعد!

اس شرط پرخریدوفروخت کرنا کہ اگر بقیہ رقم ادا کر کے چیز کواپنے قبضہ میں نہ لیا گیاتوپیشگی دیا ہوابیعانہ مارلیا جائے گا، جائزنہیں ہے۔اس قسم کی خریدوفروخت کوشرع نے حرام قرار دیا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع عربان سے منع فرمایا ہے۔حدیث میں بیع عربان کی وضاحت بایں طور کی گئی ہے کہ آدمی کسی چیز کا سودا کرے اورفروخت کنندہ کوکچھ رقم پیشگی ادا کر کے کہے’’اگر میں نے یہ چیز لے لی توٹھیک بصورت دیگرادا کردہ پیشگی رقم تیری ہوگی۔‘‘اس قسم کی خریدو فروخت کے متعلق اگرچہ فقہا کا اختلاف ہے تاہم ہمارا رجحان یہ ہے کہ ناجائز شرط اوردھوکے کی وجہ سے اس قسم کی خریدوفروخت ناجائز اورحرام ہےاور یہ کسی کا مال ناجائز طریقہ سے کھانے میں شامل ہے۔نیز بیع فسخ ہونے کی صورت میں بیچنے والا جورقم ضبط کرتا ہےاس کے عوض وہ خریدارکوکوئی مال یا فائدہ مہیانہیں کرتااوربغیرمعاوضے کےکسی کا مال لینا جائزنہیں۔علاوہ ازیں کسی معقول وجہ کی بنیاد پر بیع واپس لینا ثواب کا کام ہے،جیسا کہ حدیث میں ہے:’’جوشخص کسی مسلمان کی بیع واپس کرے گاتو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے گناہ معاف فرمادے گا۔‘‘اس حدیث کی سند کوعلامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔

لیکن بیعانہ کی شرط اس لیے عائد کی جاتی ہے کہ خریدار، خریدی ہوئی چیز واپس نہ کردے، اگر ایسا کرتا ہے تو اس کی پیشگی ادا کردہ رقم ضبط کرلی جاتی ہے، ایسا کرنا نیکی سے پہلو تہی ہے جسے کسی بھی صورت میں اچھا نہیں کہا جاسکتا، لیکن یہ بھلے وقتوں کی بات ہے جب لوگ سادہ مزاج اور امانت دار تھے، اب ہمارے اس پُرفتن دور میں جھوٹ، فریب، دغابازی، ہوشیاری اور چالاکی لوگوں کے رگ وریشہ میں رچی بسی ہے، اکثر طور پر اس سلسلہ میں درج ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں:

1 ایک آدمی کسی سے تین ماہ تک رقم کی ادائیگی پر کوئی چیز خرید لیتا ہے اور فروخت کنندہ کو زر بیعانہ بھی ادا کردیتا ہے تاکہ وہ اس چیز کو آگے فروخت نہ کرے لیکن ایک ماہ بعد اس چیز کا بھاؤ چڑھ جاتا ہے، اتفاق سے اسے کوئی گاہک بھی میسر آجاتا ہے، وہ اپنے پہلے وعدے سے منحرف ہوکر دوسرے گاہک کو چیز فروخت کردیتا ہے اور زر بیعانہ دوگنا کرکے پہلے شخص کو ادا کردیتا ہے، اس کے باوجود اسے بچت ہوجاتی ہے۔

2 بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی تیسرا آدمی خریدار کو خراب کرنا چاہتا ہے، وہ فروخت کنندہ کے پاس آکر کہتا ہے کہ تم اتنی قیمت میں وہ چیز مجھے دے دو، میں تمہیں پہلے خریدار کا زر بیعانہ بھی ادا کردیتا ہوں حالانکہ پہلے خریدار کو وہی چیز اس سے ارزاں نرخ پر ملتی تھی لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم ہے، اس طرح خریدار کو نقصان ہوتا ہے۔

3 ایک آدمی نے کسی دوسرے شخص کو کوئی چیز فروخت کی، دو تین ماہ تک اس کی قیمت وصول کرنے کی شرط کرلیتا ہے اور خریدار سے کچھ زر بیعانہ بھی وصول کرلیتا ہے، اس دوران خریدار کو وہی چیز کسی دوسرے سے ارزاں قیمت پر مل جاتی ہے تو وہ اپنے زر بیعانہ کی پروا کیے بغیر اپنے وعدے سے منحرف ہوکر کسی دوسرے شخص سے وہ چیز خرید لیتا ہے۔

4 بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی تیسرا آدمی فروخت کار کو خراب کرنا چاہتا ہے، وہ خریدار کے پاس آکر کہتا ہے کہ میں تجھے وہی چیز اس سے ارزاں قیمت پر مہیا کرتا ہوں، تم اپنا زر بیعانہ میرے کھاتے میں ڈال کر مجھ سے وہ چیز خرید لو، اس طرح وہ اپنے وعدے سے منحرف ہوجاتا ہے حالانکہ

فروخت کنندہ کواس دوران فروخت کردہ چیز کی زیادہ قیمت ملتی تھی،لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم رہا، اس طرح فروخت کنندہ کونقصان ہوتا ہے۔

ایسے حالات میں کیا کیا جائے؟ آیا خریدار یا فرخت کارکواس طرح دھوکہ،فراڈ اورایک دوسرے پر ظلم وزیادتی کرنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے یاان کا کوئی باعزت حل نکالا جائے تاکہ مظلوم اورستم زدہ انسان کے نقصان کی کچھ نہ کچھ تلافی ہو۔ حالات کے تبدیل ہونے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں، ہمارے رجحان کے مطابق ایسے حالات میں جب ایک دوسرے پرظلم ہورہا ہو،خریدار کا بیعانہ ضبط ہونا چاہیے،اسی طرح فروخت کنندہ سے دوگنا زر بیعانہ وصول کیا جاسکتا ہے۔ہاں اگرکسی مجبوری کی وجہ سے سودا فسخ کرنا پڑے توفریقین کوفراخدلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ’’اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جوفروخت کرتے وقت نرمی کرتا ہے،خریدتے وقت نرمی کرتا ہےاور جب تقاضا کرتا ہےتوبھی نرمی کرتا ہے۔‘‘فروخت کار کی نرمی یہ ہے کہ اگرخریدار اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے سودا فسخ کرنا چاہےتو وہ اس کا زر بیعانہ فراخ دلی کے ساتھ واپس کردے ۔’’بحق نقصان‘‘ ضبط نہ کرے،اسی طرح خریدار کی طرف سے نرمی یہ ہے کہ اگرحالات سے مجبور ہو کرفروخت کنندہ اس بیع کوختم کرنا چاہےتوفراخدلی کے ساتھ اس سودے کوختم کردےاوراس سے دوگنا زر بیعانہ کا مطالبہ نہ کرے بلکہ صرف اپنی دی ہوئی رقم ہی واپس لے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے کاروباری معاملات صحیح طریقہ سے چلانے کی توفیق دے۔آمین [1]

دوم:ایجنٹ کا بیعانہ ادا کرکے فائل کوآگے بیچ دینا

عصرحاضرمیں رئیل اسٹیٹ میں یہ صورت بھی عام نظرآتی ہے کہ اسٹیٹ ایجنٹ بائع کو بیعانہ کی رقم دے کردوتین ماہ کا وقت لے لیتا ہےاس وقت کے دوران وہ اس فائل کوآگے کسی تیسرے فریق کوبیچ کراس سے ایک ماہ کا ٹائم دیتا ہے جب اس سے رقم ملتی ہےتو وہ منافع رکھ کر بقیہ قیمت اصل مالک کو

[1] فتاویٰ اصحاب الحدیث ج 4 ص 247

ادا کر دیتا ہے۔ایسا کرنا بھی جائز نہیں۔

ریئل اسٹیٹ ایجنٹ کے کاروبار میں رائج ایسی ہی قباحتوں کے حوالے سے مجلس التحقیق الاسلامی کے تحت قائم کردہ محدث فورم پر ایک فتویٰ شائع ہوا جو کہ انتہائی مفید ہے بالخصوص پراپرٹی ایجنٹ جو اس کاروبار میں کرتے ہیں ان کی جملہ صورتیں سوال میں ذکر کر کے مدلل جواب دیا گیا ہے افادہ عام کیلئے یہ فتویٰ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

عنوان: کمیشن ایجنٹ کی کمائی کا حکم

سوال: السلام علیکم ورحمة الله وبركاته

ریئل اسٹیٹ بزنس سے متعلق چند فتاویٰ درکار ہیں۔اگر آپ برادران کے لئے ممکن ہو کہ محدث فتویٰ فورم سے وابستہ علمائے کرام سے ترجیحی بنیادوں پر درج ذیل جوابات فراہم کر سکیں تو احقر ممنون ہوگا۔پہلے چار سوال تو ریئل اسٹیٹ بزنس میں معمول کے ہیں جبکہ اسی سے متعلق پانچواں سوال اس وقت کراچی کے لاکھوں لوگوں سے متعلق ہے۔عام روٹ سے ہٹ کر آپ منتظمین کی معرفت سوال کرنے کا مقصد یہی ہے کہ جواب فوری طور پر مل سکے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو یہ کام فوری طور پر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

1 ریئل اسٹیٹ بزنس میں ایجنٹ ''مڈل مین'' کا کردار ادا کرتا ہے۔یعنی جائیداد کا مالک (فروخت کنندہ) کوئی اور ہوتا ہے اور خریدار کوئی اور۔اس بزنس میں ایجنٹ دونوں پارٹیوں کے درمیان سودا طے کرواتا ہے اور سودا ہو جانے کی صورت میں ہر فریق سے سودے کی مالیت کا دو فیصد کمیشن لیتا ہے۔کیا اس طرح کا بزنس جائز ہے کیونکہ احادیث میں مالک اور خریدار کے درمیان ''بروکری'' کو ناپسند کیا گیا ہے۔

2 سودا طے پا جانے کی صورت میں خریدار مالک کو سودے کی مالیت کا چند فیصد بطور زر بیعانہ فوری طور پر ادا کرتا ہے اور یہ اقرار کرتا ہے کہ فلاں تاریخ تک بقیہ رقم ادا کر کے جائیداد خرید لے گا۔اگر کسی وجہ سے معینہ تاریخ تک خریدار بقیہ رقم ادا نہیں کرتا تو سودا از خود منسوخ سمجھا جاتا ہے اور مالک زر

بیعانہ ضبط کرلیتا ہے۔اسی طرح اگر بیعانہ لینے کے بعد جائیداد کا مالک کسی بھی وجہ سے یہ سودا منسوخ کر دیتا ہے تو اُسے خریدار کو وصول شدہ زر بیعانہ اور اس کے مساوی اضافی رقم ادا کرنی ہوتی ہے۔کیا اس طرح زر بیعانہ ضبط کرنا یا دگنا زر بیعانہ واپس کرنا جائز ہے۔ واضح رہے کہ یہ عمل اس بزنس کا معمول ہے اور سب کے علم میں ہے۔

3 اکثر و بیشتر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایجنٹ مالک سے پوچھتا ہے کہ آپ اپنی جائیداد کتنی رقم میں بیچنا چاہتے ہیں۔ مالک جائیداد کی مطلوبہ قیمت بتلا دیتا ہے۔اب اگر ایجنٹ کو کوئی ایسا خریدار مل جاتا ہے جو مالک کی مطلوبہ ڈیمانڈ سے زائد قیمت میں جائیداد خریدنے کو تیار ہو تو ایجنٹ اس بات سے مالک کو آگاہ کئے بغیر سودا کروا دیتا ہے اور مالک کی مطلوبہ قیمت سے زائد رقم خود رکھ لیتا ہے۔ایجنٹ دونوں سے اپنا کمیشن الگ لیتا ہے۔کیا مالک کی مطلوبہ قیمت سے زائد ملنے والی رقم ایجنٹ کے لئے جائز ہے۔(1) اگر اس نے اس بات یہ بات مالک سے چھپائی ہو (2) اگر اس نے یہ بات مالک کو پیشگی بتلا دی ہو کہ آپ کی ڈیمانڈ سے زائد ملنے والی رقم میری ہوگی۔ واضح رہے کہ عموماً ایجنٹ یہ بات مالک کو نہیں بتلاتا البتہ اس بزنس میں اس بات سے سب ہی واقف ہیں کہ ڈیمانڈ سے زیادہ قیمت پر اگر کوئی ایجنٹ سودا کرواتا ہے تو اضافی رقم ایجنٹ ہی لے گا۔اور یہ ایک عام چلن ہے۔

4 اکثر ایجنٹ یہ بھی کرتے ہیں کہ اگر کہیں اُسے کوئی جائیداد نسبتاً سستی مل رہی ہو تو وہ اسے ''خریدنے کا سودا'' کرکے مالک کو زر بیعانہ اپنی جانب سے ادا کر دیتا ہے اور مقررہ تاریخ تک ''بقیہ رقم'' ادا کرنے کا وعدہ کرلیتا ہے۔ اس کے بعد ایجنٹ کوئی حقیقی خریدار یا دوسرا ایجنٹ تلاش کرتا ہے جو یہی سودا زیادہ قیمت پر خریدنے پر رضامند ہو۔ پھر پہلا ایجنٹ خریدار یا دوسرے ایجنٹ سے یہ ''اضافی رقم'' بطور زر بیعانہ وصول کرکے اُسے بقیہ رقم معینہ مدت تک ادا کرنے کو کہتا ہے۔بعض صورتوں میں یہ سلسلہ ایجنٹ در ایجنٹ چلتا ہے۔کیا کسی ایجنٹ کے لئے اس طرح کی ''اضافی آمدنی'' جائز ہے۔ واضح رہے کہ رئیل اسٹیٹ بزنس میں یہ ایک عام معمول ہے اور مالک جائیداد اور حقیقی خریدار بھی اس ''مارکیٹ ٹرینڈ'' سے

بخوبی واقف ہوتے ہیں۔تاہم ایجنٹ کسی بھی ڈیلنگ کے دوران مالک یا خریدار کو بطور خاص یہ نہیں بتلاتا کہ ہم آپ کے کیس میں بھی ایسا کر رہے ہیں۔گو اس طرح مالک کو اپنی ڈیمانڈ کے مطابق رقم مل جاتی ہے اور خریدار کو اپنی پسند کی قیمت پر جائیداد مل جاتی ہے لیکن اگر انہیں ایجنٹ کی اس ''انڈر دی ٹیبل کاروائی'' کا پتہ چل جائے تو شاید مالک اضافی رقم بھی مانگنے لگے یا خریدار ایجنٹ کی زیادہ ڈیمانڈ کی بجائے اصل مالک کی کم ڈیمانڈ والی رقم ہی دینے پر راضی ہو۔

5 پاکستان کی معروف ہاؤسنگ سوسائٹی ''بحریہ ٹاؤن'' نے حال ہی میں کراچی میں اپنی ہاؤسنگ اسکیم لانچ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ پہلے مرحلہ میں سوسائٹی نے ''کراچی بحریہ ٹاؤن کی ممبرشپ'' کا آغاز کیا ہے۔ یہ ''ممبرشپ'' مبلغ پندرہ ہزار روپے میں جاری کی گئی ہے۔مستقبل قریب میں جب ''بحریہ ٹاؤن کراچی'' میں پلاٹس برائے فروخت کے لئے پیش کئے جائیں گے تو صرف ''ممبرشپ'' حاصل کرنے والے افراد ہی پلاٹ خریدنے کے لئے فارم جمع کرانے کے ''اہل'' ہوں گے۔ چونکہ ممبرشپ حاصل کرنے والے افراد کی تعداد لاکھوں میں ہیں، لہٰذا پلاٹ قرعہ اندازی کے ذریعہ الاٹ ہوں گے۔قرعہ اندازی میں پلاٹ حاصل نہ کرسکنے والے اپنی ممبرشپ کی فیس میں سے دس ہزار واپس لینے کے اہل ہوں گے جبکہ پانچ ہزار روپے پیشگی اعلان کے مطابق ناقابل واپسی ہوگی۔؟

الجواب بعون الوهاب بشرط صحة السؤال

وعليكم السلام ورحمة الله وبركاته!

الحمد لله، والصلاة والسلام علىٰ رسول الله، أما بعد!

آپ کا سوال متعدد پہلوؤں پر مشتمل ہے، جن کا ترتیب وار جواب درج ذیل ہے۔

1 مڈل مین کو عربی میں سمسار کہا جاتا ہے، جو خریدار اور بائع کے درمیان واسطے کا کام کرتا ہے۔ جمہور فقہاء کرام نے مڈل مین کے کام اور اس کی اجرت کو جائز قرار دیا ہے۔لیکن شرط یہ ہے کہ اجرت پہلے طے کر لی جائے، اور مجہول نہ رکھی جائے، اور بائع ومشتری کے ساتھ سودے یا قیمت کے حوالے

سے کوئی جھوٹ نہ بولا جائے، یہ بھی مزدوری ہی کی ایک قسم ہے۔عبداللہ بن عباس سے ایسا ہی مروی ہے، ابن جریر، عطاء، نخعی، ابوثور، ابن منذر کا قول بھی یہی ہے اور یہی مسلک شوافع اور حضرات موالک و دیگر کا بھی ہے [1]

مشروعیت کے دلائل

ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (سورۃ المائدۃ:2)

وجہ استدلال: دو افراد اگر کوئی معاملہ کرتے ہیں اور وہ معاملہ غیر شرعی نہیں ہے۔اب کوئی دلال ان کے درمیان معاملہ کی تکمیل کے لیے واسطے کا کام کرے۔تو واسطے کا یہ عمل جائز منفعت میں شمار ہوگا، اور اس کا یہ عمل تعاون علی البر بھی کہلائے گا۔

سیدنا قیس بن ابوغرزہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

كُنَّا نَبْتَاعُ الْأَوْسَاقَ بِالْمَدِينَةِ، وَكُنَّا نُسَمَّى السَّمَاسِرَةَ، قَالَ: فَأَتَانَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمَّانَا بِاسْمٍ هُوَ أَحْسَنُ مِمَّا كُنَّا نُسَمِّي بِهِ أَنْفُسَنَا، فَقَالَ: ''يَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ إِنَّ هَذَا الْبَيْعَ يَحْضُرُهُ اللَّغْوُ، وَالْحَلِفُ، فَشُوبُوهُ بِالصَّدَقَةِ ۔'' [2]

''کہ ہم لوگ مدینے میں پیمانے (اوساق) خرید رہے تھے اور خود کو'' سماسرہ'' بولتے تھے کہ رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پاس آئے اور ہمیں اس سے اچھے نام سے یاد کیا،فرمایا: اے تاجروں کی جماعت: فروختگی میں لغو باتیں اور قسم (کیا کچھ نہیں) شامل ہوجاتا ،اس لیے تم اسے صدقہ سے ملا لو، (یعنی اس گناہ کو صدقہ سے مٹاؤ)۔''

---

[1] البحر الرائق:72/7، التاج والاكليل:573/6، المجموع:91/9، المغنی:72/5

[2] مسند احمد:16135

وجہ استدلال: حدیث کی عبارت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کام کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "سماسرہ" کا کام درست سمجھا البتہ (بغیر انکار کئے) ایک دوسرا نام پسند فرمایا اور انہیں "تجار" کے لقب سے یاد کیا۔ امام خطابی نے تو باقاعدہ "سمسار" کو "تاجر" سے بدل دینے کی خوبی پر بھی گفتگو کی ہے ان کا کہنا ہے کہ "سمسار" عجمی لفظ ہے اور ان میں اکثر خرید وفروخت کرنے والے عجمی تھے یہ نام انہی عجمیوں سے اخذ کردہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "تاجر" سے بدل دیا ہے اور یہ ایک عربی نام ہے۔

عموما لوگوں کو دلالی کی سخت ضرورت ہوتی ہے کیونکہ بہت سارے ایسے ہیں جو خرید وفروخت کے بارے میں نہیں جانتے، سودے بازی اور مول بھاؤ سے وہ بھلی بھانت واقف نہیں ہوتے۔ کتنے ایسے ہیں کہ انہیں کچھ خریدنا پڑ جائے تو اشیاء کی پرکھ اور چیزوں کے عیوب جاننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ کچھ ایسے بھی ملیں گے جنہیں خرید وفروخت کی فرصت ہی نہیں ہوتی ان حالات میں دلالی ایک نفع بخش عمل کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ جس سے خریدنے والے، بیچنے والے اور دلال سب ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے دلالی کرنا اور اس پر اجرت لینا غیر مشروع نہیں۔

2 وقت پر ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں بیعانہ واپس نہ کرنا، یا سودا منسوخ کرکے ڈبل بیعانہ واپس کرنا، دونوں ہی حرام ہیں، کسی کو کسی کا مال حرام طریقے سے کھانے کی اجازت نہیں ہے،۔ ارشاد باری تعالی ہے۔:

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ﴾ (سورۃ البقرہ:188)

''اور تم اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاو۔''

3 اگر تو بائع کے ساتھ اتفاق ہو جائے کہ اتنی قیمت سے زیادہ کی رقم میری ہوگی تو تب جائز ہے، امام بخاری نے سیدنا ابن عباس کا یہ اثر نقل کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کہے:

''لا بأس أن يقول: بع هذا الثوب، فما زاد على كذا وكذا، فهو لك''

آپ یہ کپڑا فروخت کریں اور جو اس قیمت سے زیادہ رقم ہوگی وہ تیری ہے۔تو یہ سودا درست ہے۔ [1]
لیکن اگر طے نہ ہو تو خاموشی سے اپنے پاس رکھنا جائز نہیں ہے۔ یہ حرام اور چوری کے زمرے میں شمار ہوگا، اگرچہ پہلے سے معروف ہی کیوں نہ ہو۔

4 بیعانے پر آگے فروخت کرنا درست نہیں ہے کیونکہ آپ نے اسے قبضے میں نہیں لیا اور کوئی بھی چیز قبضہ میں لئے بغیر اسے آگے فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

حکیم بن حزام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں کچھ سامان خریدتا ہوں تو اس میں میرے لئے کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے؟ آپ نے فرمایا:

" إِذَا اشْتَرَيْتَ بَيْعًا فَلاَ تَبِعْهُ حَتَّى تَقْبِضَهُ " [2]

جب تم کوئی چیز خریدو تو اس کو نہ بیچو یہاں تک کہ اس پر قبضہ کرلو۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

"وَكُنَّا نَشْتَرِى الطَّعَامَ مِنَ الرُّكْبَانِ جزَافًا فَنَهَانَا رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم أَنْ نَبِيعَهُ حَتَّى نَنْقُلَهُ مِنْ مَكَانِهِ " [3]

اور ہم تاجروں سے غلے کو اٹکل سے خریدتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کو بیچنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ ہم اسے اس کی جگہ سے منتقل کردیں۔

اور علامہ سید سابق رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وليس هذا خاصا بالطعام بل يشتمل الطعام وغيره " [4]

یہ صرف غلے کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ یہ غلہ اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں کو بھی شامل ہے۔
معلوم ہوا کہ کسی بھی سامان کو اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے بیچنا درست نہیں ہے۔

---

[1] صحيح البخاری:باب فی أجر السمسرة

[2] رواه احمد والبيهقي وابن حبان باسناد حسن

[3] صحيح البخاري:ا 2/ 747،صحيح مسلم : 3/ 1160

[4] فقه السنة :3/240

5 بحریہ ٹاون کی ممبر شپ ایک جوا ہے،جس کے ذریعے پلاٹ حاصل کرنے کی لوگ کوشش کررہے ہیں،اب بعض تو اس کو حاصل کرلیں گے اور بعض اس سے محروم رہ جائیں گے،اور یہ صورت جوا میں ہی ہوتی ہے۔پھر ان کا صرف دس ہزار روپے واپس کرنا،اور باقی واپس نہ کرنا سراسر ظلم اور زیادتی ہے،وہ لوگوں کا مال ناجائز اور حرام طریقے سے کھا رہے ہیں۔(اگر وہ لوگوں کو فری ممبر شپ دیتے تو جائز تھا۔)اسی طرح پلاٹ کے لئے ممبر شب کی شرط لگانا ایک بیع میں دو بیعوں کی شکل ہے،جو شرعا حرام ہے۔

هذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

فتوی کمیٹی،محدث فتوی [1]

سوم: آڑھت کے کاروبار میں چند ناجائز صورتیں۔

اسی طرح آڑھت کے کاروبار میں بھی چند ناجائز صورتیں در آئی ہیں جو کہ سراسر شرعی اعتبار سے جائز نہیں آڑھتی کے پاس دو قسم کے بیوپاری آتے ہیں۔پہلی قسم کے بیوپاری اپنے سرمایہ سے کوئی جنس خرید کر لاتے ہیں اور آڑھتی کی وساطت سے فروخت کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے بیوپاری وہ ہوتے ہیں جو کچھ معمولی سا سرمایہ اپنا لگاتے ہیں اور بقیہ آڑھتی سے اس شرط پر قرض لیتے ہیں کہ اپنا خریدا ہوا مال اسی آڑھتی کے ہاتھ فروخت کریں گے اور بوقت فروخت مال آڑھتی کا روپیہ بھی ادا کردیں گے۔آڑھتی پہلی قسم کے بیوپاریوں سے اگر ایک پیسہ فی روپیہ کمیشن لیتا ہے تو اس دوسری قسم کے بیوپاریوں سے دو پیسہ فی روپیہ لے گا۔

یہاں یہ فرق جو آڑھتی اپنے کمیشن میں رکھتا ہے،شرعی طور پر سراسر غلط ہے۔قرض لینے والے سے دو پیسہ اور قرض نہ لینے والے سے ایک پیسہ فی روپیہ آڑھت لینا سود کے حکم میں آتا ہے اسی حوالے سے صحیح بخاری کی ایک حدیث ہے:

عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي بُرْدَةَ عَنْ أَبِيهِ أَتَيْتُ الْمَدِينَةَ فَلَقِيتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ سَلَامٍ رَضِيَ اللَّهُ

[1] https//:shamilaurdu.com/book/ijtimaee-nizam/1335/
https//:urdufatwa.com/view/1/9213

عَنْهُ فَقَالَ أَلَا تَجِيءُ فَأُطْعِمَكَ سَوِيقًا وَتَمْرًا وَتَدْخُلَ فِي بَيْتٍ ثُمَّ قَالَ إِنَّكَ بِأَرْضٍ الرِّبَا بِهَا فَاشٍ إِذَا كَانَ لَكَ عَلَى رَجُلٍ حَقٌّ فَأَهْدَى إِلَيْكَ حِمْلَ تِبْنٍ أَوْ حِمْلَ شَعِيرٍ أَوْ حِمْلَ قَتٍّ فَلَا تَأْخُذْهُ فَإِنَّهُ رِبًا‘‘[1]

سعید بن ابی بردہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ حاضر ہوا تو میں نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی، انہوں نے کہا، آؤ تمہیں میں ستو اور کھجور کھلاوں گا اور تم ایک (باعظمت) مکان میں داخل ہوگے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس میں تشریف لے گئے تھے، پھر آپ نے فرمایا تمہارا قیام ایک ایسے ملک میں ہے جہاں سودی معاملات بہت عام ہیں اگر تمہارا کسی شخص پر کوئی حق ہو اور پھر وہ تمہیں ایک تنکے یا جو کے ایک دانے یا ایک گھاس کے برابر بھی ہدیہ دے تو اسے قبول نہ کرنا کیونکہ وہ بھی سود ہے‘‘۔

اس حوالے سے ایک اور روایت بھی بیان کی جاتی ہے جو کہ سنداً ضعیف ہے البتہ اہل علم نے اس کے مفہوم کو دیگر نصوص کی روشنی میں صحیح قرار دیا ہے کہ ’’كل قرض جر نفعاً فهو ربا۔‘‘[2]

اسی طرح آڑھتی بیچنے اور خریدنے والے سے مال کا سودا ہوجانے کے بعد اس میں سے کچھ مقدار ’’چونگی‘‘ کے نام سے لے لیتا ہے۔ مثلاً پھل ہوں تو ان میں سے چند دانے لے لے گا اور سبزی ہو تو اس میں اپنا حصہ لگائے گا۔ یہ چونگی بھی دراصل ایک غنڈہ ٹیکس ہے

اور آڑھتی کی جانب سے بہت بڑی زیادتی ہے۔ وہ جب اپنا طے شدہ کمیشن لے چکا تو اب اسے اور کچھ لینے کا حق نہیں۔ بقول بعض اہل علم کہ ’’حقیقت میں یہ ’’دست درازی‘‘ ہے جس کا ایک معصوم نام ’’چنگی‘‘ رکھ لیا گیا ہے‘‘۔

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

[1] صحيح البخاری 3814

[2] أخرجه الحارث بن أبي أسامة في ’’مسنده‘‘:رقم 437

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ کا شمار برصغیر (پاک وہند) کی جماعت اہلحدیث کے صف اول کے ممتاز علمائے کرام میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں گونا گوں صفات سے متصف فرمایا تھا وہ بیک وقت مفسر قرآن بھی تھے اور محدث بھی وہ مجتہد بھی تھے اور فقیہ بھی، مورخ بھی تھے اور محقق بھی، خطیب بھی تھے اور مقرر بھی، معلم بھی تھے اور متکلم بھی دانشور بھی تھے اور ادیب بھی، مبصر بھی تھے اور نقاد بھی، صحافی بھی تھے اور مصنف بھی مناظر بھی تھے اور مبلغ بھی۔

مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ 1874ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سیٹھ غلام قادر تھا۔ مولانا سیالکوٹی کا گھرانہ دینی تھا۔ چنانچہ مولانا نے 1895ء کو میٹرک کا امتحان ہائی سکول غلہ منڈی سیالکوٹ سے پاس کیا تو سیالکوٹ کے مشہور کالج مرے کالج میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں مصور پاکستان شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال ان کے ہم جماعت تھے۔ مگر والدین کی خواہش تھی کہ ہمارا بیٹا دینی تعلیم حاصل کرے اور خود مولانا کا بھی دینی تعلیم کی طرف رجحان تھا، اس لیے کالج کو خیر باد کہا اور دینی تعلیم کے حصول کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔

مولانا سیالکوٹی نے ابتدائی دینی تعلیم مولانا غلام حسن سیالکوٹی المتوفی (1336ھ) سے حاصل کی اس کے بعد مزید علوم اسلامیہ کے حصول کے لیے استاد پنجاب حافظ عبد المنان محدث وزیر آبادی المتوفی (1334ھ) اور شیخ الکل حضرت میاں سید محمد نذیر صاحب محدث دہلوی المتوفی (1320ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ 1332ھ مطابق 1916ء میں آپ نے تعلیم مکمل کی اور اپنے علاقے سیالکوٹ تشریف لائے، ایک دینی درسگاہ بنام ''دارالحدیث'' قائم کیا اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ جب دہلی کے دو متمول بھائیوں شیخ عبد الرحمان اور شیخ عطاء الرحمان نے دارالحدیث رحمانیہ کے نام سے دہلی شہر میں ایک عظیم دینی درسگاہ قائم کی تو اُن کے ابتدائی مدرسین میں مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔

دسمبر **1906**ء کو آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس قائم ہوئی۔ مولانا سیالکوٹی اس کے تاسیسی اجلاس میں شامل تھے۔ ملک کے طول عرض میں کانفرنس کو متعارف کروانے کے لیے تین رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ مولانا سیالکوٹی بھی اس تین رکنی کمیٹی میں شامل تھے۔ دوسرے دو ارکان مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔ مولانا مرحوم نے درس و تدریس، تصنیف و تالیف، دعوت و مناظرہ، وعظ وتذکیرغرض ہر محاذ پر کام کیا اور شہرت کے بام عروج کو جا پہنچے۔ ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سیاست میں مولانا کا میلان مسلم لیگ کی جانب تھا۔ **1930**ء میں مسلم لیگ کا اجلاس جو الہ آباد میں منعقد ہوا، مولانا اس میں بھی شریک تھے۔ **1940**ء کے جس اجلاس میں قرارداد پاکستان پاس ہوئی اس اجلاس میں بھی مولانا موجود تھے۔ تحریک پاکستان کی حمایت کے لیے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مولانا سیالکوٹی کی خدمات کا دائرہ کار بڑا وسیع ہے۔ مولانا سیالکوٹی بانی پاکستان محمد علی جناح کے رفقا میں شمار کیے جاتے تھے۔

سیاسی خدمات کے ساتھ ساتھ مولانا کی دینی خدمات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، تصنیف و تالیف کے باب میں آپ نے گرانقدر یادگار چھوڑی ہیں جو کہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہیں۔ آپ کتب کثیرہ کے مصنف ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) واضح البیان، (۲) سیرتِ مصطفیٰ، (۳) تائید قرآن، (۳) تعلیم القرآن، (۴) تاریخ اہل حدیث، (۶) تاریخ نبوی (۷) اصلاح عرب، (۸) تبصیر القرآن فی تفسیر القرآن (پارہ اول تا سوم) تفسیر سورۃ کہف (۹) عصمت النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۱۰) بشارتِ محمدیہ، (۱۱)۔ علم الوصول الی اسرار الرسول، (۱۲) سراجاً منیرا، (۱۳) فرقہ ناجیہ، (۱۴) خلافتِ راشدہ، (۱۵)۔ اعجاز القرآن، (۱۶) الخبر الصحیح عن قبر المسیح، (۱۷)۔ آئینہ قادیانی، (۱۸) فیصلہ ربانی برمرگِ قادیانی، (۲۹) رحلتِ قادیانی، (۲۰) انارۃ المصابیح، (۲۱) زاد المتقین (۲۲) شہادۃ القرآن۔

مولانا اسحاق بھٹی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: ''مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ اپنے عہد کے جلیل القدر عالم، منقول و معقول کے ماہر۔ بہت بڑے مناظر، کثیر التصانیف مصنف، دین کے بارے میں نہایت غیور، عزت نفس کی حفاظت کے سلسلے میں انتہائی جری، بارعب اور صاحب جلال بزرگ

تھے۔ اللہ نے ان کو دین اور دنیا دونوں سے نوازا تھا۔ جس بات کو غلط سمجھتے اس پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے غلطی پر ٹوکنا، برائی سے روکنا اور صحیح راہ کی تلقین کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا۔ اس ضمن میں وہ کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے کوئی مانے یا نہ مانے وہ ہر حال میں کلمہ حق بلند کرتے تھے۔"

مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ **12** جنوری **1956**ء کو سیالکوٹ میں وفات پا گئے، ان کی نماز جنازہ مجتہد العصر، فقیہ وقت، مفتی جماعت، استاذ الاساتذہ حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ نے پڑھائی۔

آپ نے احیاء سنت اور رد تقلید دفاع منہج اہل حدیث پر بھی گرانقدر خدمات انجام دیں،

زیر نظر مضمون آپ کی انہی کاوشوں میں سے ایک عظیم کاوش ہے جس میں اہل حدیث کے طرز استدلال کو اجاگر کیا گیا ہے اور احناف کے خود ساختہ اصولوں کے تار و پود بکھیر دیے ہیں۔

وقت کی ضرورت اور موضوع کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مضمون کو جو کہ تاریخ اہل حدیث کا حصہ ہے۔ بغرض استفادہ قارئین یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ واللہ من وراء القصد

اہلِ حدیث کا طرزِ استدلال وطریقِ اجتہاد

اور احناف کا خودساختہ اصولوں کی بنیاد پر احادیث کا انکار

امام العصر مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ [1]

محدثین رحمہم اللہ (اہلحدیث) نصوص شرعیہ کی حفاظت کے علاوہ ان کے صحیح محمل کے سمجھنے اور صرف نصوص ہی کو اصول قرار دے کر ان سے مسائل استنباط کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے؟ مناسب ہے کہ اہلحدیث کے اس خاص طرزِ استدلال اور طریقِ اجتہاد کو بھی بیان کر دیں جس کی وجہ سے وہ انحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحیح مراد سے ذرہ بھر بھی نہیں بھکے۔

اس سے اس بات پر بھی روشنی پڑے گی کہ عمل بالحدیث میں اہلحدیث کے سوا دوسرے فرقوں نے کسی ایسے امر کی بھی رعایت ضروری جانی جو ان کے خیال میں عمل بالحدیث کے لیے بمنزلہ شرط تھا اور آخر کار وہ عمل بالحدیث کے سامنے ایک آڑ اور اوٹ ہو گیا۔ جس سے ان کے دلوں پر سنت کی محبت وشوق کے جلوۂ نوری، جو درمیانی حجابات کے اٹھ جانے کی صورت میں پڑ سکتا تھا، نہ پڑ سکا۔

نیز یہ امر واضح ہو جائے گا کہ باوجود اس کے کہ اہلحدیث بھی آیات واحادیث سے استنباط واستخراج کرتے ہیں، پھر بھی ان کا نام اہلحدیث ہی ہے اور اہل رائے نہیں ہے اور باوجود اس کے کہ دوسرے بھی حدیث نبوی کو اصل اور ماخذ قرار دیتے ہیں، لیکن ان کو اہلحدیث نہیں کہتے، بلکہ کسی کو تو اہل ہویٰ اور کسی کو اہل رائے کہتے ہیں۔

---

[1] جماعت اہل حدیث کے مشہور ومعروف صاحب مؤلفات کثیرہ متبحر اہل حدیث عالم دین، وفات 12 جنوری 1956ء

بفضل اللہ یہ فصل عمل بالحدیث میں اہل حدیث کی خصوصیت کے واضح کرنے میں اور دوسرے لوگوں کو اہلحدیث کی طرف مائل کرنے میں عجب مؤثر ثابت ہوگی۔ والاستعداد والسعادة شرط لاستفادة

محدثین کے استنباط میں ایک خاص کمال ہے کہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا کہ یہ پاک نفوس دائیں بائیں جھانکنے کے بغیر اور از خود قیاسی اصول وضع کرنے کے سوا براہِ راست سنت مطہرہ سے ایسے سہل اور صاف طریق سے استنباط کرتے ہیں کہ بامذاق طبیعت کہ جو کسی خارجی اثر سے دبی نہ ہو، سکون وتسلی ہو کر صاف نظر آنے لگ جاتا ہے کہ ہاں شارع علیہ السلام نے اس امر کو ضرور ملحوظ رکھا ہے اور یہ بات آپ کے پاک کلمات کی جامعیت اور وحی من عنداللہ ہونے کی دلیل ہے، ورنہ کسی کلام کو قیاسی اصول کے سانچے میں ڈھال کر کسی مسئلے کا استخراج کر لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ لیکن اس میں اتنا تردد ضرور باقی رہ جاتا ہے کہ اللہ جانے یہ اجتہاد شارع۔ علیه السلام والتحية۔ کو امر تشریع میں بھی منظور بھی تھا یا نہیں؟

محدثین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحیح مراد سمجھنے کا یہ ملکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کی محبت اور شب وروز اسی کے شغل وتوغل سے نصیب ہوا اور قاعدہ ہے کہ غلبۂ محبت کی وجہ سے محب پر محبوب کا رنگ آجاتا ہے اور محبوب کے کلام کو اور اس کے اشارات ورموز کو جیسا اس کا محبّ سمجھتا ہے کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔

میان عاشق ومعشوق رمزیست ۔۔۔۔ کراماً کاتبین راہم خبر نیست

محدثین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطابات کے سمجھنے میں صرف انہی قواعد علمیہ وشرعیہ کی رعایت ضروری جانی جو فہم خطاب کے لیے بعض عقلی اور بعض عرفی ہوتے ہیں اور سب سے اوپر یہ کہ جس طرح کسی خاص فن میں خاص اصطلاحی معانی کے وقت ان الفاظ کے لغوی وعرفی معانی ترک کر دیے جاتے ہیں، اسی طرح اگر کسی لفظ کے مفہوم میں شریعتِ مطہرہ نے کچھ توسیع یا تقیید کر دی ہے تو محدثین اس لفظ کے معنی ومفہوم میں شرعی تصرف کا لحاظ ضروری جانتے ہیں اور اس کے مقابلے میں حقیقتِ لغوی اور استعمال عرفی پر بس نہیں کرتے۔ مثلاً صوم، صلوٰۃ اور حج وزکوٰۃ کہ لغت

میں ان کے معانی علی الترتیب یہ ہیں، بندش، دعا، قصد اور پاکیزگی۔

لیکن شریعت میں ان سے ایک خاص ہیئت ووقت کی بندش یعنی روزہ اور ایک خاص ہیئت وآداب کی دعا وعبادت یعنی نماز، اور ایک خاص مقام کا قصد یعنی بیت اللہ شریف کا، اور ایک خاص قسم کی پاکیزگی متعلق مال کے یعنی صدقۂ مفروضہ مراد ہے، اگرچہ شرعی اور لغوی وعرفی معانی ہیں، مناسبت باقی رہتی ہے، لیکن ان کی حدود میں فرق آجاتا ہے، اسی طرح لغت میں ''رکوع'' کے معنی ہیں: ''اِنْحِنَاء''، یعنی جھکنا، اور شریعت میں ایک خاص ہیئت وحالت میں جھکنے کو رکوع کہتے ہیں۔ چنانچہ قاموس میں ہے۔

''والركوع في الصلوٰة أن يخفض رأسه بعد قومة القراءة حتى تنال راحتاه ركبتيه أو حتى يطمئن ظهره''[1]

''نماز میں ''رکوع'' اس کا نام ہے کہ قومۂ قراءت (قیام) کے بعد سر کو اتنا جھکائے کہ دونوں ہتھیلیاں دونوں گھٹنوں پر ہوں اور پشت مطمئن (ہموار) ہو۔''

اسی طرح لغت میں سجدہ کے معنی جھکنے، عاجزی کرنے کے بھی ہیں اور کھڑے ہونے کے بھی ہیں۔ چنانچہ قاموس میں ہے:

''سجد: خضع وانتصب ،ضد''

یعنی سجدہ کے معنی گرا اور کھڑا ہوا، دونوں ہیں اور یہ لفظ ذوات الاضداد میں سے ہے، جن کے معنی آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔

لیکن شریعت میں سجدہ اسے کہتے ہیں کہ دونوں ہاتھ اور دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں کی انگلیوں کے سرے زمین کے ساتھ لگے ہوں اور پیشانی مع ناک زمین پر لگی ہو، تاکہ پیٹ کے بل لیٹ کر یا کسی اور طرح سے پیشانی زمین پر رکھنے سے فرق ہوجائے۔

تو اب جس جگہ شریعت میں سجدے اور رکوع کا حکم ہوگا، وہاں اہلحدیث کے نزدیک ان کے لغوی معنی پر بس نہیں ہوگی، بلکہ اگر شرعی مفہوم کے رو سے ادا کیے جائیں گے تو سجدہ ورکوع کہلائیں

[1] القاموس المحيط للفيروز آبادي:971/2

گے ورنہ نہیں۔اور ظاہر ہے کہ رکوع میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے اور پشت کو ہموار کرنے کی قید اور سجود میں دونوں ہاتھ اور دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں زمین سے لگے رہنے کی قید ان کے مفہوم لغوی پر زائد امر ہے۔ یہ اسی لیے ہے کہ خطابات شرعیہ میں مفہوم شرعی کا لحاظ ضروری ہوتا ہے اور صرف مفہوم لغوی پر بس نہیں ہوتی۔

تفسیر اتقان میں اس کی اور مثالیں بھی لکھی ہیں۔

حدیث میں ایسی نماز کو شمار میں نہیں رکھا جس میں رکوع وسجود میں اور ان دونوں سے اٹھنے کی حالت میں پیٹھ سیدھی نہ کی جائے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لا تجزئ صلوٰة لا يقيم الرجل فيها صلبه في ركوعه وسجوده"[1]

"وہ نماز کفایت نہیں کرتی جس میں آدمی اپنی پشت رکوع وسجود میں درست نہ کرے۔"

نیز یہ کہ صحیح بخاری وغیرہ میں جو مذکور ہے کہ ایک شخص رکوع سجود وغیرہ ارکانِ نماز درست طور پر ادا نہیں کرتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو بار بار فرماتے تھے: "إرجع فَصَلِّ فإنك لم تصل" یعنی "نماز پھر لوٹا کر پڑھ، کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔" تو اس کی بھی یہی وجہ تھی کہ اس کی نماز میں یہ ارکان ہیئت شرعی سے ادا نہ ہوتے تھے۔ ورنہ حقیقت لغوی تو وہاں بھی موجود تھی۔

حنفی قاعدہ "الخاص لایحتمل البیان"

لیکن اس کے مقابلے میں حضرات حنفیہ کا مذہب بالکل جدا ہے۔ وہ پہلے ایک قاعدہ بناتے ہیں اور اس کے مطابق قرآن کا مفہوم مقرر کرتے ہیں، پھر اس قاعدے پر جزئیاتِ مسائل کو متفرع کرتے ہیں وہ جزئیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان اور طریق عمل کے موافق ہوں یا نہ ہوں اس سے غرض نہیں۔ عدم موافقت کی صورت میں اس روایت کے قبول کرنے میں چند ایک عذر بنا رکھے ہیں۔ ان میں سے کوئی پیش کر دیا جاتا ہے، چنانچہ ہم ان قواعد وعذرات کو مثالوں سے سمجھاتے ہیں۔

[1] سنن دار قطنی، باب لزوم إقامة الصلب في الركوع والسجود حديث: 1

پہلی مثال: مسئلہ تعدیل ارکان

حضرات احناف کے نزدیک نماز میں رکوع وسجود فرض تو ہیں، لیکن صرف ان کی لغوی حد تک، اطمینان واعتدال از روئے لغت ان کی ماہیت میں داخل نہیں ہیں تو یہ فرض بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص بغیر اطمینان واعتدال کے رکوع سجود کرے تو اس کی نماز فاسد و باطل نہیں ہوگی۔ بلکہ ناقص ہوگی، جس کی تلافی سجدۂ سہو سے ہوسکتی ہے۔ اس امر کی دلیل کوئی آیت یا حدیث (قولی وفعلی) نہیں ہے، بلکہ ایک قاعدہ ہے، جوانہوں نے خود بنایا کہ جولفظ مفہوم المعنی ہواس کے لیے کسی زائد بیان کی ضرورت نہیں، چنانچہ ''منار'' متن نورالانوار میں ہے:

''الخاص لا يحتمل البيان لكونه بينا'' (ص:15)

یعنی ''جولفظ خاص ہووہ کسی بیان کا محتاج نہیں کیونکہ وہ خود واضح ہے۔''

اور پھر اس پر یہ مسئلہ تفریع کیا ہے:

''فلا يجوز إلحاق التعديل بأمر الركوع والسجود على سبيل الفرض''۔[1]

''پس رکوع اور سجود کے حکم کے ساتھ تعدیل (ارکان) کو بھی فرضیت کے طور پر ملحق کرنا جائز نہیں۔''

اس متن کی شرح میں صاحب نورالانوار فرماتے ہیں:

''بيانه أن الشافعي يقول:تعديل الأركان في الركوع والسجود فرض، لحديث أعرابي خفف في الصلوٰة، فقال له عليه السلام، قم فصل فإنک لم تصل،هكذا قاله ثلاثا، ونحن نقول،: إن قوله تعالىٰ(و) اركعوا واسجدوا خاص وضع لمعنى معلوم لأن الركوع هوالانحناء عن القيام،والسجود هو وضع الجبهة على الأرض، والخاص لا يحتمل البيان حتى يقال: إن الحديث لحق بيانا للنص المطلق فلا يكون إلا نسخا، وهو لا يجوز بخبر الواحد فينبغيأن تراعىٰ منزلة كل من

[1] منار، ص15

الكتاب والسنة فما ثبت بالكتاب يكون فرضا لأنه قطعي، وما ثبت بالسنة يكون واجبا لأنه ظني"[1]

''اس کا بیان اس طرح ہے کہ ''امام'' شافعی کہتے ہیں کہ رکوع وسجود میں تعدیل ارکان فرض ہے، اس اعرابی والی حدیث کی رو سے جس نے نماز ہلکی کر کے پڑھی تھی تو آنحضرت ﷺ نے اسے فرمایا تھا کہ اٹھ اور نماز پھر پڑھ کیونکہ تو نے نماز ادا نہیں کی، آنحضرت ﷺ نے اس کو تین دفعہ اسی طرح فرمایا تھا۔ اور ہم (حنفی) کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا امر (اركعو) اور (اسجدو) خاص ہے، جو معلوم معنی کے لیے وضع کیا گیا ہے، کیونکہ رکوع قیام سے ٹیڑھا ہونے کو اور سجود پیشانی زمین پر رکھنے کو کہتے ہیں۔ اور (لفظ) خاص متحمل بیان نہیں ہوتا، جو کہا جائے کہ نص (آیت) مطلق ہے اور حدیث مذکور اس کے بیان کے لیے ہے (اگر ایسا کیا جائے) تو سوائے نسخ (حکم قرآن) کے اور کیا ہوگا۔ اور یہ بات (نسخ الكتاب بالسنة) خبر واحد سے جائز نہیں، پس مناسب ہے کہ قرآن وسنت میں سے ہر ایک کے مرتبے کی رعایت رکھی جائے، پس جو قرآن سے ثابت ہوا وہ فرض ہے کیونکہ قرآن قطعی ہے اور جو کچھ سنت سے ثابت ہوا وہ واجب ہے کیونکہ سنت ظنی ہے۔''

یہ عبارت ہمارے مقصود کے اثبات میں ایسی عیاں ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ مصنف مرحوم نے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب نقل کیا کہ وہ تعدیل ارکان کو بھی فرض جانتے ہیں اور ان کی دلیل وہی حدیث مسیئ[2] بیان کی۔ پھر اپنا مذہب ذکر کیا کہ ہم تعدیل ارکان کو فرض نہیں بلکہ واجب جانتے ہیں اور دلیل میں کوئی آیت نہیں، حدیث نہیں، بلکہ اپنا ایک قاعدہ بیان کیا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم (اركعوا) اور (اسجدوا) معلوم المعنی ہے اور جو لفظ معلوم المعنی ہو وہ محتمل بیان نہیں ہوتا، اس کے لیے امر خداوندی مفہوم لغوی کی حد تک محدود رہے گا اور آنحضرت ﷺ نے جو کچھ فرمایا وہ اس کے درجے کا یعنی فرض نہیں ہوگا۔ بلکہ اس سے کم رتبے کا یعنی واجب ہوگا۔ اور حدیث کے

---

[1] نور الأنوار، ص 15

[2] یعنی ایسے شخص کے ذکر والی حدیث جس نے ایسے برے طریق سے نماز پڑھی تھی کہ آنحضرت ﷺ نے اسے نماز لوٹانے کو فرمایا تھا، جس کا ذکر صحیح بخاری کے حوالے سے اوپر گزر چکا ہے۔ (میر سیالکوٹی رحمہ اللہ)

مقابلے میں یہ عذر کردیا کہ اول تو آیت مطلق نہیں ہے کہ اس کے بیان کی ضرورت ہو، دیگر یہ کہ یہ حدیث خبر واحد ہے، جو ظنی الثبوت ہے اور اس سے قرآن کا حکم منسوخ نہیں ہوسکتا۔ گویا اس کے یہ معنی ہیں کہ رکوع وسجود کے متعلق جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحیثیت شارع وامین وحی ہونے کے فرمایا وہ امر خداوندی کا بیان نہیں ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے موافق دیگر محدثین حدیثِ مسیٔ اور دیگر احادیث کے نقشے کو زیر نظر رکھ کر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بار بار ''لم تصل''، ''تو نے نماز نہیں پڑھی'' فرمانے کو ملحوظ رکھ کر کہتے ہیں کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کو بار بار فرمایا ''إنك لم تصل''، یعنی تو نے نماز نہیں پڑھی۔ تو اس کے یہی معنی ہیں کہ وہ نماز جس کا حکم اللہ نے میری معرفت فرمایا ادا نہیں ہوئی۔ اس لیے تم پھر پڑھو اور میرے ہدایت کردہ طریق کے مطابق پڑھو تاکہ صحیح طور پر ادا ہو اور شمار میں آسکے۔ اگر ان امور کی رعایت جو وہ ترک کرتا تھا، شرعاً فرض نہ ہوتی، فرض سے کم درجہ کی یعنی واجب ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے بار بار پڑھنے کا حکم نہ کرتے بلکہ جبرِ نقصان اور اس کے تدارک کی صورت یعنی سجدۂ سہو کا حکم فرماتے، جیسا کہ حضرات حنفیہ کا مذہب ہے۔

نہ تو یہ تھا کہ وہ شخص رکوع سجود ترک کر دیتا تھا اور نہ یہ تھا کہ ان کے لغوی معنی کی حد (انحنا اور پیشانی زمین پر رکھنا) کو پورا نہ کرتا تھا، بلکہ تھا تو یہ تھا کہ وہ تعدیل ارکان نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے آپ نے اسے ہر ایسے رکن کی نسبت فرمایا:

''❶ حتی تطمئن راکعاً، ❷ حتی تطمئن قائماً، ❸ حتی تطمئن ساجداً، ❹ حتی تطمئن جالساً۔''[1]

لہٰذا تعدیل ارکان کا حکم ویسا ہی فرض ہے جیسا خود رکوع اور سجود اور قومہ اور جلسہ کا، یا یوں کہیے کہ اللہ نے نماز میں جس رکوع وسجدے کا حکم کیا ہے اس کی عملی صورت یہ ہے کہ تعدیل واطمینان سے کیا جائے۔ لیکن حضرات احناف اس حدیث کو مع اس کی جملہ خصوصیات کے خاطر میں نہ لاکر

---

[1] صحیح بخاری حدیث: 757، کتاب الأذان باب وجوب القرأة الإمام والمأموم، حدیث: 757

اپنے قاعدہ ''الخاص لا یحتمل البیان'' سے ایک تل برابر بھی نہیں ہٹ سکے اور مرادِ خدا اور مرادِ رسول میں فرق جانا۔ حالانکہ آنحضرت ﷺ مبین و شارح قرآن ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اپنے بندوں سے جو کچھ فرمایا یا ان سے چاہا کہ وہ ایسا کریں، آنحضرت ﷺ اس مرادِ خداوندی کے بیان کرنے والے ہیں، چاہے آپ اپنی زبان مبارک سے فرماویں اور چاہے اپنے طریق عمل سے بتلا اور سمجھا دیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل:44)

''(اے پیغمبر!) ہم نے یہ ذکر (نصیحت نامہ یعنی قرآن) آپ کی طرف اس لیے اتارا ہے کہ آپ لوگوں کے (علم و عمل کے) لیے وہ احکام جو ان کی طرف اتارے گئے ہیں، نہایت صفائی سے کھول دیں۔''

جب آنحضرت ﷺ کا منصب تبیین قرآن ہے تو اللہ اور رسول کے فرمودہ میں فرق کرنا کیسے جائز ہوا؟ یاللہ العجب۔!!

اس وقت ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ محدثین جو کچھ کہتے ہیں، نصوص قرآنیہ اور آثار نبویہ کی متابعت میں کہتے ہیں، پہلے قواعد بنا کر پھر نصوص کو ان کے پیچھے نہیں لگاتے، لیکن دوسری طرف پہلے قواعد بنائے جاتے ہیں اور پھر نصوص کو ان کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے اور جزئیات کو ان پر متفرع کیا جاتا ہے تاکہ ان اصول و قواعد اور ان جزئیات کا سلسلہ و رابطہ منقطع نہ ہو جائے، آثار نبویہ کی رعایت رہے یا نہ رہے۔ وھل ھذا إلا عکس الموضوع؟!

ہم نے محدثین کرام اور حضرات احناف کے طریق اجتہاد اور طرزِ استدلال میں جو یہ فرق بتایا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اس کی نسبت فرماتے ہیں:

''باید دانست کہ سلف در استنباط مسائل و فتاویٰ بر دو وجہ بودند اول آنکہ قرآن و حدیث و آثار صحابہ جمع میکردند و از انجا استنباط می نمودند و ایں طریقہ اصل راہ محدثین است و دیگر آنکہ قواعد کلیہ کہ جمعے از ائمہ تنقیح و تہذیب آن کردہ اند یاد گیرند۔ بے ملاحظۂ ماخذ آنہا، پس ہر مسئلہ کہ وارد می شد جواب آں از ہماں قواعد طلب می کردند و ایں طریقہ اصلِ راہ فقہاء ست۔''[1]

[1] مصفیٰ شرح فارسی موطا: 1/124

اسی طرح حضرت شاہ صاحب حجۃ اللہ میں اہل رائے کے مصداق کی نسبت فرماتے ہیں:

"بل المراد من أهل الرأي قوم توجهوا بعد المسائل المجمع عليها بين المسلمين أو بين جمهورهم إلىٰ التخريج على أصل رجل من المتقدمين فكان أكثر أمرهم حمل النظير على النظير والرد إلى أصل من الأصول دون تتبع الأحاديث والآثار۔"[1]

"بلکہ اہل رائے سے وہ قوم مراد ہے جو ان مسائل کے بعد جو مسلمانوں میں بالاتفاق یا ان میں اکثر کے نزدیک مسلّم ہیں، متقدمین میں سے کسی شخص کے (مقرر کردہ) اصول پر تخریج مسائل کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا کام احادیث وآثار کی پڑتال کے بغیر زیادہ تر نظیر کو نظیر پر قیاس کرنا اور اصول میں سے کسی قاعدے کی طرف لوٹانا ہی رہا۔"

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ سے پیشتر علامہ شہرستانی، جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بڑے حامی ہیں "الملل والنحل" میں حضرات احناف کے اہل رائے سے ملقب ہونے کی وجہ میں فرماتے ہیں:

"وإنما سمّوا أصحاب الرأي لأن عنايتهم بتحصيل وجه من القياس والمعنى المستنبط من الأحكام وبناء الحوادث عليها، وربما يقدمون القياس الجلى على آحاد الأخبار، وقد قال أبو حنيفة رحمه الله، علمنا هذى رأي، وهو أحسن ماقدرنا عليه، فمن قدر على غير ذلك فله مارأىٰ، ولنا مارأيناه۔"[2]

"ان کا نام اصحاب رائے اس لیے ہوا کہ ان کی توجہ کسی قیاسی وجہ اور احکام میں سے کسی اجتہادی معنی کو حاصل کرنے اور پھر ان پر حوادث کو قیاس کرنے کی طرف ہے اور کبھی تو یہ بھی کرتے ہیں کہ قیاس جلی کو احادیث احاد پر مقدم کر دیتے ہیں، حالانکہ خود امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ہمارا یہ علم (فقہ) رائے ہے اور یہ وہ بہتر سے بہتر (صورت) ہے جس پر ہم قادر ہو سکے۔ اور جو اس کے سوا پر قادر ہو سکے اس کے لیے وہی جائز ہے جو اس نے سمجھا اور ہمارے لیے وہ جو ہم نے سمجھا۔"

---

[1] حجة الله البالغة، طبع مصر :160/1 فصل بعد باب حكاية حال الناس الخ

[2] شهر ستانى على هامش كتاب الفصل :46/2

ان حوالہ جات کو ملحوظ رکھ کر ایک نظر صحیح بخاری پر رکھیں اور دوسری حسامی نور الانوار اور اصول بزدوی پر، اور دیکھیں کہ ان دونوں گروہوں کے طرزِ استدلال اور طریق استنباط میں کتنا فرق ہے۔کس نے استنباط کے وقت کتاب وسنت کو پیشوا بنایا ہے اور کس کے طریق اجتہاد سے یہ لازم آتا کہ اگر بالفرض جزئیات حدیثیہ یا نصوص نبویہ موجود نہ بھی ہوتیں تو بھی ان کو استخراج مسائل میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی تھی ،یعنی نصوص نبویہ ﷺ کی رعایت وحفاظت ان کے نزدیک ضروری نہیں اسی لیے ان کے اصحاب تخریجات میں سے اکثر بزرگ ایسے بھی گزرے ہیں جو علم حدیث میں مہارت نہ رکھتے تھے۔ [1]

امام بخاری رحمہ اللہ اور صحیح بخاری کی تصنیف

صحیح بخاری جو صحت روایات کے علاوہ جزئیات کی کثرت اور براہِ راست سنت مطہرہ اور احادیث معتبرہ سے استنباط کرنے اور صحت وسہولت استخراج ودِقت اجتہاد میں جملہ کتب مؤلفہ پر فوقیت رکھتی ہے، حضرت شاہ صاحب اس کی خصوصیات میں فرماتے ہیں کہ اہلحدیث نے پہلے پہل جو علم حدیث کی تدوین شروع کی تو اسے چار فنون میں مدوّن کیا۔سنن میں جن کو فقہ بھی کہتے ہیں ،مثل مؤطا امام مالک اور جامع سفیان کے،اور فن تفسیر میں مثل کتاب ابن جریج کے،اور فن سیرت میں مثل محمد بن اسحاق کی کتاب کے،اور فن زہد ورقاق میں مثل کتاب ابن مبارک کے۔پس امام بخاری رحمہ اللہ نے چاہا کہ ان ہر چہار فنون کو ایک ہی کتاب میں جمع کردیں۔پھر یہ کہ صرف وہی حدیثیں لکھیں جن کی بابت امام بخاری کے وقت اور اس سے قبل کے علمائے (حدیث) نے صحت کا حکم لگایا تھا۔نیز صرف مرفوع اور مسند احادیث لکھیں اور جو کچھ اس میں جنس آثار (موقوفہ) وغیرہ سے ہے، وہ تبعاً ہے نہ اصالتاً۔اور اسی لیے (امام ممدوح نے) اپنی (اس کتاب) کا نام ”الجامع الصحیح المسند“

[1] اس کے لیے حجۃ اللہ کے ”باب الفرق بین أھل الحدیث وأصحاب الرأي“میں آخری” وذلک أنه لم یکن عندھم من الأحادیث“ سے اخیر باب تک پڑھنا چاہیے۔نیز مولوی عبدالحئ لکھنوی نے بھی،عمدۃ الرعایۃ “میں اس کا اعتراف کیا ہے۔چنانچہ لکھتے ہیں۔”ومن الفقھاء من لیس لھم حظ إلا ضبط المسائل الفقھیة من دون المھارۃ فی الروایات الحدیثیة“(1/13)نیز حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں مجتہدین فی المذہب کی علمی قابلیتوں کے متعلق یہی فرق بتایا ہے۔اللھم اغفرلکاتبه ولمصنفه ولمن سعی فیه ولوالدیھم أجمعین آمین (میر سیالکوٹی رحمہ اللہ)

رکھا، یعنی سب فنون کو جمع کرنے والی صحیح اور مرفوع روایتوں کے بیان کرنے والی کتاب۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

”وأراد أيضاً أن يفرغ جهده في الاستنباط من حديث رسول الله ﷺ، ويستنبط من كل حديث مسائل كثيرة جدا،وهذا أمر لم يسبقه أحد إلى غيره،غير أنه استحسن أن يفرق الأحاديث في الأبواب،ويودع في تراجم الأبواب سرّ الاستنباط۔“[1]

”نیز امام بخاری نے یہ چاہا کہ اپنا سارا زور رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے استنباط کرنے میں لگا دیں اور ہر حدیث سے نہایت کثرت سے احکام مستنبط کریں۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ امام بخاری سے پہلے کسی اور نے نہیں کی، لیکن امام ممدوح نے یہ مناسب جانا کہ ان احادیث کو مختلف ابواب (کے ذیل میں) متفرق طور پر ذکر کریں اور استنباط کے نکات اور رموز تراجم ابواب میں رکھیں۔“ (تاکہ ہر ایک حدیث سے بہت سے مسائل مستنبط ہونے کے الگ الگ عنوان قائم ہو جائیں۔) ولله درّ هذا الإمام الهمام ماأدق فهمه!

دوسری مثال: آنحضرت ﷺ کا طریق بیان اور طرزِ عمل

محدثین قواعدِ زبان عرب اور آنحضرت ﷺ کے بیان وطریق عمل کے علاوہ آپ کے طریق سخن، طرز بیان اور طریق عمل کا لحاظ بھی ضروری جانتے ہیں کیونکہ متکلم کی مراد کے صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی روزمرہ کی عادت، گفتگو بلکہ سنت فعلی اور طریق عمل کا بھی لحاظ رکھا جائے، مثلاً کسی امر کے لازم اور ضروری ہونے کے لیے آنحضرت ﷺ کے کلام پاک میں کہیں تو یہ پایا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ فلاں کام بغیر فلاں کام کے نہیں ہے، مثلاً آپ نے فرمایا:

”لاصلوٰة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب“[2]

”اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو (اس میں سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا۔“

---

[1] شرح تراجم، أبواب بخاری مصنفہ شاہ صاحب رحمہ اللہ، ص:2،3

[2] صحیح بخاری كتاب الأذان باب وجود القرأة للإمام والمأموم حديث:756

اس میں سورۃ فاتحہ کی حیثیت نماز میں ایسی قرار دی ہے کہ اس کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں۔ [1] اور کہیں اس طرح پایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''لا تجزي صلوٰة لايقيم الرجل فيها صلبه في ركوعه وسجوده'' [2]

''وہ نماز کفایت نہیں کرتی جس میں آدمی رکوع وسجود میں اپنی پشت سیدھی نہ کرے۔''

اس میں رکوع وسجود کے علاوہ ان میں اطمینان واعتدال کو ایسا ضروری گردانا کہ بغیر ان کے آدمی نماز سے عہدہ برآ ہی شمار نہیں ہوتا۔

اور کبھی یوں پایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ'' [3]

''جس شخص نے ایمان اور نیتِ ثواب سے رمضان میں قیام کیا (نماز تراویح پڑھی) اس کے سابقہ گناہ سب بخشے گئے۔''

اس میں نماز کو قیام سے تعبیر کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ حالت قیام نماز میں ایک ایسا امر ہے، جس پر نماز کا نام ہے تو یہ ایک ضروری رکن ہے اور کسی جگہ اس طرح فرمایا:

''تحريمها التكبير وتحليلها التسليم'' [4]

''نماز میں ''اللہ اکبر'' کہہ کر داخل ہوں اور سلام سے خارج ہوں۔''

اس میں تکبیر تحریمہ نماز میں داخل ہونے کے لیے اور سلام یعنی ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہنا نماز سے فارغ ہونے کے لیے ضروری ہے۔

ان امور مذکورہ بالا یعنی قراءت سورۃ فاتحہ، اطمینان واعتدال، قیام، تکبیر تحریمہ اور سلام کے متعلق یہ تو آپ کے اقوال ہیں، جو مختلف عنوانوں سے بیان کیے گئے ہیں اور ادھر آپ کے افعال میں ایسا

---

[1] نیز حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ مصفی میں فرماتے ہیں: ''اما تتبع نصوص واشارات شرع پس مثال آں ''لاصلوٰة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب الخ (20/1) (میر سیالکوٹی رحمہ اللہ)

[2] سنن دار قطنی باب لزوم إقامة الصلب في الركوع والسجود حديث: 1

[3] صحیح بخاری، كتاب الإيمان، باب تطوع قيام رمضان من الايمان حديث: 37

[4] ترمذی، ابواب الطهارة باب ماجاء ان مفتاح الصلاة الطهور حديث: 3

کبھی نہیں پایا گیا کہ ان امور میں سے کوئی امر بھی آپ نے اختیاراً وعمداً ترک کیا ہو۔ لہٰذا محدثین کے نزدیک یہ سب امور نماز کے ارکان ہیں اور اس کی شرعی ماہیت میں داخل ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی ترک کر دیا جائے تو نماز صحیح نہیں ہوگی۔ لیکن فقہائے حنفیہ کے نزدیک ان میں سے قراءت سورت فاتحہ اور تعدیل ارکان اور خاتمہ پر سلام فرض نہیں ہیں، حالانکہ ان سب امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال وافعال ایک ہی حیثیت سے پائے گئے ہیں، پس ان میں سے بعض کو فرض اور بعض کو واجب اور بعض کو سنت قرار دے کر فرق کرنا درست نہیں۔ [1] اور اپنے اصول مستخرجہ اور قواعد مقررہ کی بنا پر احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایچا پیچیاں نکالنا متبعین سنت کی علامت نہیں ہے۔ [2]

تیسری مثال

یہ ہے کہ اصول شاشی میں ہے:

"وكذلک قوله تعالىٰ ﴿حَتّٰى تَنكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ﴾ خاص في وجود النكاح من المرأة فلا يترك العمل به بما روى عن النبي ﷺ أنه قال: أيما امرأة نكحت نفسها بغير إذن وليها فنكاحها باطل باطل باطل" [3]

یعنی "اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول ﴿حَتّٰى تَنكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ﴾ (صرف) عورت کے ایجاب سے نکاح کے منعقد ہو جانے میں خاص ہے، پس اس پر عمل کرنا اس روایت کے رو سے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ "جو عورت ولی کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح کرے گی تو اس کا

---

[1] صاحب ہدایہ وغیرہ نے جو دلائل و وجوہات پیش کیے ہیں، ان کو ضعیف ورکیک جان کر نظر انداز کیا گیا ہے۔ اور قابل جواب نہیں سمجھا گیا۔ فافهم (میر سیالکوٹی رحمہ اللہ)

[2] حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین میں ایک طویل فہرست ان احادیث کی دی ہے جو قائلینِ قیاس نے بوجہ مخالفت قیاس ترک کر دی ہیں اور پھر کہا ہے کہ اسی طرح اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن کو قائلینِ قیاس نے چھوڑ دیا ہے، حالانکہ وہ سب صحیح ہیں اور قیاس کے خلاف بھی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی اپنی سمجھ کی غلطی ہے کہ ان کی سمجھ پیغمبر صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کے مطابق نہیں اتری۔

وكم من عائب قولاً صحيحاً وآفته من الفهم السقيم

چنانچہ یہ امر آئندہ بیان کردہ مثالوں سے بخوبی واضح ہو جائے گا (میر سیالکوٹی رحمہ اللہ)

[3] اصول شاشي بحث الخاص

نکاح باطل ہوگا باطل ہوگا باطل ہوگا۔'' ترک نہیں کیا جائے گا۔''

یہ عبارت اپنا مطلب بیان کرنے میں صاف ہے کہ جب قرآن شریف سے سمجھا جاتا ہے کہ صرف عورت کے ایجاب سے نکاح منعقد ہوسکتا ہے تو اگر چہ حدیث میں ایسے نکاح کو بتاکید شدید باطل کہا گیا ہے۔ پھر بھی اس کی پرواہ نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ لفظ﴿ تَنكِحَ ﴾مؤنث کا صیغہ ہے اور اس میں فعل نکاح کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے۔ اس لیے بالغہ عورت اپنا نکاح خود بخود بغیر ولی کی اجازت کے بھی کرسکتی ہے اور حدیث میں جو مذکور ہے کہ ایسا نکاح باطل ہے۔ اس کا اعتبار نہیں، کیونکہ اگر اس کا اعتبار کیا جائے تو آیت قرآنی ترک ہوجاتی ہے، کیونکہ فعل نکاح اپنے معنی میں خاص یعنی معلوم المعنی ہے جو محتاج بیان نہیں، پس حدیث مذکور کو ترک کردیا جائے گا اور قرآن مجید کی آیت کو پکڑ لیا جائے گا۔ چنانچہ فصول الحواشی شرح اصول الشاشی میں اسی عبارت بالا کی شرح میں لکھا ہے:

''ونحن تركنا الخبر الواحد بمقابلة الخاص من الكتاب''[1]

''اور ہم نے (حنفیہ نے) اس حدیث کو جو خبر واحد ہے ترک کردیا ہے بمقابلہ قرآن کے خاص کے۔''

تنبیہ

ظاہر میں تو سمجھا جائے گا کہ قرآن مجید کی عظمت کو قائم رکھنے کے لیے ہر چیز کو جو کسی نہج سے بھی معارض قرآن ہو ترک کردیا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں اپنے مقررہ قاعدہ (خاص) کے مقابلہ میں حدیث نبوی ﷺ سے انکار کرنے کا ایک مہذب حیلہ ہے۔﴿ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا ﴾

اللہ اللہ کس قدر جرأت ہے کہ جس امر کو آنحضرت ﷺ تین دفعہ بتاکید فرماویں، اسے معارض قرآن کہہ کر ٹال دیا جائے پھر اس کے معنی تو یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ باوجود افصح العرب ہونے کے نہ تو اپنی زبان جانتے تھے اور نہ باوجود رسول اللہ ﷺ اور معلّم شریعت ہونے کے قرآن سمجھتے تھے۔ زبان عربی کے ماہر ہوئے تو عجمی اور قرآن کے عالم ہوئے تو امتی۔ أستغفر الله ثم أستغفر الله۔۔۔!!

اگر یہ عذر کردیا جاتا کہ یہ حدیث صحیح نہیں، یا یہ کہہ دیا جاتا کہ آنحضرت ﷺ کی مراد ابطال

---

[1] فصول، ص:26

سے ابطال حقیقی نہیں تو اتنا مضائقہ نہ تھا، صرف علمی تحقیقات کا اختلاف رہتا، لیکن ناظرین آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ والعیاذ باللہ

جواب

اچھا جناب والا: اگر آیت میں نکاح کی نسبت عورت کی طرف کرنے سے ولی کی شرطیت اس سے زائد ہوکر قابل ردّ ہے تو آیت میں بالغہ نابالغہ کا بھی تو فرق نہیں ہے۔ اور مرد کی قبولیت کا بھی ذکر نہیں ہے اور حضور شاہدین (دو گواہوں) کا بھی ذکر نہیں ہے۔ پس جس طرح بالغہ عورت اپنے نکاح کی مختار ہے، اسی طرح نابالغہ بھی ہونی چاہیے، اور جس طرح عورت بغیر ولی کی اجازت کے استقلالاً اپنے اختیار سے نکاح کر سکتی ہے۔ اسی طرح اس کا نکاح بغیر شہادت شاہدین کے بھی درست سمجھا جانا چاہیے اور مرد کی قبولیت کے بغیر بھی نکاح منعقد ہو جانا چاہیے، حالانکہ یہ سب صورتیں آپ کے نزدیک نادرست ہیں نہ تو آپ صغیرہ کو بغیر ولی کی اجازت کے اختیار نکاح دیتے ہیں اور نہ مرد کی قبولیت کے بغیر آپ نکاح جائز جانتے ہیں اور نہ شاہدین کے بغیر آپ کوئی نکاح درست جانتے ہیں، چنانچہ بدایہ متن ہدایہ میں ہے:

"ولا ينعقد نكاح المسلمين إلا بحضور شاهدين"[1]

''اور مسلمانوں کا نکاح (کم از کم) دو گواہوں کی حاضری کے بغیر منعقد نہیں ہوتا۔''

اور اس کی شرح میں ہدایہ میں کہا ہے:

"اعلم أن الشهادة شرط في باب النكاح لقوله عليه السلام: لا نكاح إلا بشهود"[2]

''معلوم ہونا چاہیے کہ معاملہ نکاح میں شہادت شرط ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نکاح درست نہیں ہوتا مگر گواہوں سے۔''

اس مقام پر کم از کم دو گواہوں کی حاضری شرط رکھی ہے اور اس کے ثبوت میں ایک حدیث بیان کی ہے، لیکن اس کی تخریج حسب عادت ذکر نہیں کی۔ یعنی یہ نہیں بتایا کہ اس حدیث کو کس امام حدیث

[1] هداية: 2/كتاب النكاح

[2] هداية: 2/286

نے روایت کیا۔ خیر صاحب ہدایہ نے تو نہیں بتایا لیکن خاتمۃ الحفاظ عسقلانی رحمہ اللہ تخریج ہدایہ میں اس کی بابت فرماتے ہیں:

"لم أره بهذا اللفظ" یعنی "میں نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ کہیں نہیں دیکھا۔"

سبحان اللہ! ایسی حدیث سے استناد کرنا جو حفاظ محدثین کے دیکھنے میں بھی نہ آئی ہو اور ایسی حدیث سے انکار کر دینا جسے امام احمد، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ وغیرہم رحمہم اللہ بڑے بڑے ائمہ حدیث نے روایت کیا ہو اور امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہو، حدیث نبوی کو بالاستقلال دلیل شرعی جاننے والے کے نزدیک نہایت تعجب خیز ہے۔

اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ بالغہ عورت کے نکاح میں ولی کی اجازت اپنے امام کے نزدیک ضروری نہیں، اس لیے وہ قابل تسلیم نہیں۔ اگرچہ حدیث میں صاف مذکور ہے اور چونکہ حضور شاہدین اپنے امام کے نزدیک ضروری ہے، اس لیے اسے شرط قرار دیا گیا، اگرچہ وہ حدیث جس سے استناد کیا گیا ہے، بے اصل محض ہے۔

اس کے بعد ہم یہ بھی ذکر کر دینا مناسب جانتے ہیں کہ امام زیلعی حنفی رحمہ اللہ نے بھی تخریج ہدایہ میں اس حدیثِ شہود کی تخریج میں نہیں بتایا کہ اسے کس امام حدیث نے روایت کیا، بلکہ صرف اسی قدر کہہ کر اس کا بے اصل ہونا ظاہر کر دیا، "غريب بهذا اللفظ" اور اس کے بعد اس کے مضمون کو دیگر احادیث سے ثابت کیا ہے، چنانچہ وہ عبارت یوں ہے۔

"وفي الباب أحاديث، منها ما أخرجه ابن حبان في صحيحه عن سعيد بن يحيىٰ بن سعيد الأموى ثنا حفص بن غياث عن ابن جريج عن سليمان بن موسىٰ عن الزهري عن عروة عن عائشة قالت: قال رسول الله ﷺ: لا نكاح إلا بولي وشاهدي عدل، وما كان من نكاح على غير ذلك فهو باطل فإن تشاجروا فالسلطان ولي من لا ولي له۔"[1] انتهى

"اس کی بابت کئی ایک (دیگر) احادیث (بھی) ہیں، جن میں سے ایک یہ (بھی) ہے، جسے

[1] نصب الراية للإمام الزيلعي :2/2

ابن حبان نے اپنی صحیح میں سعید بن یحیٰی اموی سے روایت کیا، اس نے کہا: ہم سے حفص بن غیاث نے حدیث بیان کی۔ اس نے ابن جریج سے اس نے سلیمان بن موسیٰ سے اس نے امام زہری سے اس نے عروہ سے اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح نہیں ہوتا مگر ولی اور دو عادل گواہوں سے اور جو نکاح اس کے سوا ہو وہ باطل ہے اور اگر اولیاء آپس میں اختلاف کریں تو سلطان ہر اس شخص کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہیں۔''

اس کے بعد امام ابن حبان کا قول اس کے بعض روایوں کی نسبت ذکر کے اخیر میں بطور فیصلہ امام ابن حبان سے نقل کیا ہے:

''ولا يصح في ذكر الشاهدين غيرهذا الخبر''[1]

''اس حدیث کے سوا دیگر کوئی حدیث (نکاح کے) دو گواہوں کے ذکر میں صحیح ثابت نہیں ہے۔''

ہم اس مقام پر اس حدیث سے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور جس طرح اس میں حضور شاہدین کا ذکر ہے، اسی طرح ولی کی ضرورت بھی مذکور ہے، پس ایک امر کو لے لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا ایں چہ؟

طرفہ یہ کہ بقول امام ابن ہمام رحمہ اللہ کے حضور شاہدین کے بارے میں اس کے سوا دیگر کوئی حدیث صحیح نہیں۔ لیکن اشتراط والی حدیث مذکور الفوق کا مضمون دیگر احادیث سے بھی ثابت ہے۔

تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى

اس کے بعد ہم اس عقدہ کو کھولتے ہیں جو صاحب اصول شاشی نے حدیث ''أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَابَاطِلٌ'' زیر بحث کی نسبت فرمایا کہ یہ خبر واحد ہے، سو معلوم ہو کہ یہ خبر واحد نہیں کیونکہ اشتراط ولی کے مضمون کو کوئی تیس (ایک) صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ چنانچہ ''الروضة الندية شرح الدرر البهية'' میں شیخ شیخنا حضرت نواب صاحب رحمہ اللہ اس حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں:

---

[1] ص: 2

"قال الحاكم:قد صحت الرواية فيه عن أزواج النبي ﷺ عائشة وأم سلمة وزينب بنت جحش ثم سرد تمام ثلاثين صحابيا"[1]

"امام حاکم نے کہا کہ اس امر میں آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات حضرت عائشہ وام سلمہ وزینب بنت جحش کی روایات صحیح ثابت ہوچکی ہیں (امام حاکم نے) تیس اصحابوں کے نام بہ ترتیب ذکر کیے ہیں۔"

یہ تو صحابہ کی تعداد ہے اور ان کے بعد تو ہر زمانہ میں اس کے راوی زیادہ ہی زیادہ ہوتے گئے، اگر ہم ان سب کا نقشہ بنا کر بتائیں تو مضمون بہت طویل ہوجائے گا۔

دیگر یہ کہ آنحضرت ﷺ سے لے کر مابعد کے زمانوں تک مسلمانوں کا تعامل اس کثرت کے ساتھ ملایا جائے تو مسئلہ اشتراط ولی متواترات شرعیہ میں شمار ہوسکتا ہے اور بالخصوص فقہاء حنفیہ کے نزدیک بھی کم ازکم اسے مشہور تو ضرور مانا جاسکتا ہے پس اس سے قرآن مجید پر زیادت بالاتفاق جائز ہوسکتی ہے، کیونکہ مشہور حدیث سے کتاب اللہ کی تخصیص اور اس پر زیادت حضرات حنفیہ کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔

دیگر یہ کہ اصول شاشی میں بحث خاص ہی میں اس مسئلہ زیر بحث میں چند سطور پیشتر مذکور ہے:

"فإن أمكن الجمع بينهما بدون تغير في حكم الخاص يعمل بهما"[2]

"پس اگر خاص کا حکم بدلنے کے بغیر ان دونوں میں جمع ممکن ہو تو دونوں پر عمل کیا جائے گا۔"

اس کے مطابق ہم کہتے ہیں کہ آیت وحدیث زیر بحث میں جمع ممکن ہے اور (تنکح) کے خاص ہونے میں کوئی تغیر نہیں آتا، پس حدیث مذکور متروک نہیں ہوسکتی۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ شریعت مطہرہ کے نصوص کے استقراء سے معلوم ہے کہ عقد ارکان شرعی یہ امور ہیں: ❶ عورت کی طرف سے ایجاب، ❷ اس کے ولی کی اجازت، ❸ مرد کی طرف سے قبول، ❹ کم ازکم دو گواہ، ❺ اور کسی قدر مہر بھی۔

---

[1] روضة،ص:186، مطبوعه مصر

[2] أصول شاشي بحث خاص

صغیرہ اور کنیز کے لیے تو بالاتفاق ولی و مولی کی ضرورت ہے اختلاف صرف بالغہ کی نسبت ہے کہ اس کے لیے ولی کی اجازت ضروری ہے یا نہیں؟

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ضروری نہیں ہے اور امام مالک و امام شافعی و امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک اس کے لیے بھی ولی کی ضرورت ہے۔ سیدنا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف سے یہ ایک دلیل ہے کہ لفظ قرآن (تنکح) میں نسبت فاعلی عورت کی طرف ہے، پس بالغہ عورت اپنا نکاح آپ کر سکتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں فعل عورت کی طرف اس لیے نسبت کیا گیا کہ چونکہ انعقاد نکاح کے لیے منکوحہ بالغہ کی رضا بھی منجملہ شرائط کے ہے، اس لیے علم معانی کی رو سے اس کی طرف فعل کی اسناد جائز ہے۔ پس (تنکح) کی اسناد سے صرف اتنا ثابت ہوسکتا ہے کہ اپنے عقد نکاح میں بالغہ عورت کو بھی دخل ہے، اس میں حصر کی کوئی دلیل نہیں کہ امرِ نکاح صرف اسی کے ہاتھ میں ہے، کیونکہ ایسے قضیہ ایجابیہ میں مذکور کا ثبوت ہوتا ہے اور اس سے ماعدا کی نفی لازم نہیں آتی۔ كما تقرر فى كتب المنطق فافهم ولا تكن من القاصرين۔

اور حدیث مذکور میں یہ بتایا گیا ہے کہ عورت کی منظوری کے علاوہ ولی کی اجازت بھی ضروری ہے، چنانچہ عورت کی منظوری لفظ (نکحت) سے اور ولی کی اجازت لفظ اذن سے ظاہر ہے، پس جس طرح شاہدین کی حاضری مفہوم آیت سے زائد ہے اور ہم نے حدیث کی رو سے تسلیم کر لی ہے، اسی طرح ولی کی اجازت مفہوم آیت سے زائد ہے جو اسی حدیث اور اس قسم کی دیگر احادیث سے ثابت ہے لہٰذا اسے بھی تسلیم کرنا ضروری ہے۔

غرضیکہ حدیث میں بھی قرآنی امر کو نظر انداز نہیں کیا گیا، یعنی یہ نہیں کیا گیا کہ بالغہ عورت امر نکاح میں بے اختیار محض ہے جس سے مفہوم قرآنی میں تغیر آجاتا ہو، بلکہ مفہوم قرآنی کو ثابت رکھ کر اس سے ایک زائد امر بھی بتایا ہے، لہٰذا برعایت دیگر جمیع احادیث، جن میں شرائط نکاح مذکور ہیں، آیت: (تنکح) سے یہ مراد ہوگی کہ وہ عورت برعایت ارکان شرعیہ نکاحِ شرعی کرے، یہ نہیں کہ جس طرح چاہے کر لیوے۔

تنبیہ:

ہاں اتنی بات ضرور ہوگی کہ ہماری تحریر کے مطابق (تنکح) میں نکاح سے شرعی نکاح مراد ہوگا، نہ لغوی اور حنفیہ اور اہلحدیث ہر دو کے نزدیک حقیقت شرعی، حقیقت لغوی وعرفی پر مقدم ہوتی ہے۔کما تقدم وتقرر في الأصول۔

اور شرط ولی کو اس مقام پر اس آیت میں اس لیے ذکر نہیں کیا کہ شروط بلاغت میں سے یہ بھی ہے کہ متکلم مقتضائے حال کو ملحوظ رکھے اور اس کے مطابق کلام کرے اور کسی امر کے ذکر کی ضرورت وعدم ضرورت اکثر متکلم کے ارادہ کے ماتحت ہوتی ہے۔پس اللہ تعالیٰ حکیم کے نزدیک یہ مقام مقتضی ذکر نہیں۔اور اس سے تھوڑا آگے اولیاء کو صاف الفاظ میں خطاب کر کے فرمایا:

﴿فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ﴾ (البقرة:232)

''جب مطلقہ عورتوں کی عدت پوری ہوجائے اور وہ اپنے (طلاق دینے والے) خاوندوں سے آپس کی رضامندی سے پھر نکاح کرنا چاہیں تو تم ان کو اس بات سے نہ روکو۔''

اس جگہ ﴿فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ﴾ میں اولیاء کو خطاب ہے۔اگر اولیاء کو بالغہ کے نکاح میں کچھ بھی حق نہ ہوتا تو ان کو ﴿فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ﴾ سے خطاب نہ کیا جاتا، بلکہ بے اختیار محض قرار دے کر ساقط الاعتبار کہہ دیا جاتا اور ﴿أَن يَنكِحْنَ﴾ میں نکاح کو عورتوں کی طرف نسبت کر کے ان کا حق ایجاب سمجھا دیا ہے اور ﴿تَرَاضَوْا بَيْنَهُم﴾ میں عورت کا ایجاب اور مرد کا قبول بتایا ہے۔

پس جہاں مناسب جانا صرف ایک بات ذکر کی اور جہاں مناسب جانا دوسرے امر بھی ذکر کردیے۔ ﴿وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ کیونکہ ان سب کو امر نکاح میں دخل ہے اور یہی معنی ہیں حدیث ''الثيب أحق بنفسها من وليها'' کے کہ ثیبہ کا حق ولی کی نسبت زیادہ ہے، یہ نہیں کہ ولی بے اختیار محض ہے کیونکہ ''أحق'' اسم تفصیل کے بعد ''مِنْ'' وارد ہے اور اسم تفصیل کا ایسا استعمال مقابلہ کے لیے آتا ہے امام نووی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

''أجاب أصحابنا عنه بأنها أحق أي شريكة في الحق''

''ہمارے اصحاب (شوافع) نے اس کا یہ جواب دیا کہ وہ (عورت) احق یعنی حقدار ہونے

میں شریک ہے۔“

حاصل کلام یہ کہ فعل کے اسناد کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ بالغہ عورت کی رضا بھی منجملہ شرائط نکاح کے ہے، باقی رہا ولی کا بھی دخل سو یہ اس کے خلاف نہیں۔ ہاں زائد ہے جس کا لحاظ دیگر آیات میں برابر رکھا گیا ہے اور حدیث میں اس کا ذکر صراحت اور صفائی سے کر دیا گیا ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ مبین قرآن ہیں، یعنی خداوند عالم نے اپنے پاک کلام کے ذریعہ جو کچھ چاہا اسے بیان کرنے والے ہیں، چاہے اپنی زبانِ وحی ترجمان سے بیان کر دیں، چاہے اپنے طریق عمل سے بتا دیں، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل:44)

”(اے پیغمبر!) ہم نے یہ نصیحت نامہ یعنی قرآن شریف آپ کی طرف اس لیے اتارا ہے کہ آپ لوگوں کے لیے وہ احکام جو ان کی طرف (عمل کے لیے) اتارے گئے ہیں، واضح طور پر بیان کر دیں گے۔“

هذا والله يهدي من يشاء إلى صراط مستقيم۔

چوتھی مثال

یہ ہے کہ اصولِ شاشی میں بحث عام میں کہا ہے:

”وكذلک قوله تعالیٰ: ﴿وَأُمَّهَاتُكُمُ الَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ﴾ يقتضي بعمومة حرمة نكاح المرضعة، وقد ورد في الخبر: لا تحرم المصة ولا المصتان ولا الإملاجة ولا الإملاجتان، ولم يمكن التوفيق ههنا فيترك الخبر“ [1]

”اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ قول (وأمهاتكم التي أرضعنكم) اپنے عموم سے مرضعہ کے نکاح کی حرمت کا مقتضی ہے اور حدیث میں وارد ہوا ہے ایک بار یا دو بار پستان کا چوسنا ایک بار یا دو بار پستان بچے کے منہ میں ڈالنا (نکاح کو) حرام نہیں کرتا۔ اس مقام پر آیت اور حدیث میں موافقت ممکن نہیں، پس حدیث کو چھوڑ دیا جائے گا۔“ معاذ الله

[1] أصول شاشی بحث عام، ص6

یہ عبارت بھی اپنے مطلب میں صاف ہے کہ حدیث نبوی کو کلیۃً متروک قرار دے دیا گیا ہے، بلکہ صاحب ہدایہ مرحوم نے تو اس سے بھی سخت لکھ دیا، چنانچہ فرماتے ہیں:

''وما رواہ مردود بالكتاب أو منسوخ به''[1]

''امام شافعی نے جو حدیث مذکور روایت کی ہے وہ قرآن مجید سے مردود ہے یا منسوخ۔''

منسوخ کہنا تو بڑی بات نہیں، لیکن سنت صحیحہ ثابتہ کو مردود کہنا بہت ثقیل ہے۔ عفا الله عنا وعنه

امام نووی شرح صحیح مسلم میں اسی حدیث کے ذیل میں ایک ایسے ہی اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں:

''(ومنها) أن بعضهم زعم أنه مضطرب، وهذا غلط ظاهر، وجسارة على رد السنن بمجرد الهوىٰ، وتوهين صحيحها لنصرة المذاهب، وقد جاء في اشتراط العدد أحاديث كثيرة مشهورة، والصواب أشتراطه۔''[2]

''ایک ان میں سے یہ ہے کہ بعض نے یہ گمان کیا کہ یہ حدیث مضطرب ہے اور یہ بالکل صاف غلط ہے اور (اپنے اختیار کردہ) مذاہب کی نصرت کے لیے محض اپنی خواہش سے (رسول اللہ ﷺ) کی سنتوں کر رد کر دینے اور صحیح سنن کو ضعیف قرار دے دینے پر جرأت ہے، حالانکہ عدد (رضعات) کے شرط ہونے کے متعلق بہت سی مشہور احادیث وارد ہوئی ہیں اور درست یہی ہے کہ (عدد رضعات) شرط ہے۔''

اور اس سے کچھ پہلے دعویٰ نسخ کے متعلق فرماتے ہیں:

''(ومنها) أن بعضهم ادعى أنها منسوخة، وهذا باطل، لا يثبت بمجرد الدعوىٰ۔''[3]

''ان میں سے ایک یہ ہے کہ بعض نے ان کی منسوخی کا دعویٰ کیا ہے اور وہ بالکل باطل ہے جو خالی دعویٰ سے ثابت نہیں ہو سکتا۔''

---

[1] هداية، كتاب الرضاع: 329/1

[2] صحيح مسلم مع نووی: 468/1

[3] ص: 468

اس کے بعد ہم یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ حدیث بلا شک صحیح ہے۔ امام مسلم کے علاوہ اس حدیث کو دیگر ائمہ حدیث نے بھی روایت کیا ہے، مثلاً امام ترمذی نے اپنی جامع میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا اور پھر کہا:

”وفي الباب عن أم الفضل رضی اللہ عنہا وأبي هريرة والزبير الخ۔“ اور امام دارقطنی نے اپنی سنن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا (حضرت عباس کی بیوی) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور حضرت زید بن ثابت سے اور امام ابن ماجہ نے حضرت ام الفضل اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور امام ابوداؤد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور امام نسائی نے مجتبیٰ میں حضرت ام الفضل سے، امام محمد رحمہ اللہ نے اپنے موطا میں اس حدیث مذکورہ بالا کو تو روایت نہیں کیا، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری روایت کو امام مالک رحمہ اللہ کے واسطہ سے روایت کیا ہے، جس میں پانچ رضعات کا ذکر ہے۔ اور اسے دیگر محدثین نے بھی روایت کیا ہے۔ پس عدد رضعات کی حدیث کو جسے بہت سے محدثین نے کئی ایک صحابہ رضی اللہ عنہم سے بہت سے سلسلہ اسناد سے روایت کیا ہو، مخالف قرآن قرار دے کر ٹال دینا حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخت بے قدری ہے۔ اللّٰھم احفظنا

جمع بين الآية والحديث (آیت اور حدیث کے مابین جمع)

اس کے بعد ہم اصل امر کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ آیت حرمتِ رضاع اور حدیث عددِ رضعات میں مخالفت نہیں ہے۔ بلکہ حدیث مبین قرآن ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محرم نکاح وہ رضاع ہے جو پانچ بار چوسا ہو، لیکن اگر پستان منہ میں لے کر ایک یا دو بار چوسا جائے تو اللہ کے نزدیک اس کا اعتبار نہیں ہے۔

اس دلیل سے جو ہم سابقاً کئی دفعہ ذکر کر آئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی مراد بیان کرنے والے ہیں جیسا کہ آیت ﴿ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ﴾ (النحل: 44) سے ظاہر ہے اور وہ بیان بھی اللہ تعالیٰ کا تعلیم کردہ ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴾ (القیامہ: 19) یعنی پھر یہ کہ (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کو) قرآن کا بیان (سمجھا دینا) بھی ہمارا ذمہ ہے۔

اس آیت رضاعت سے حنفیوں کی صورت استدلال یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے عدد رضعات کا ذکر نہیں کیا بلکہ صرف رضاع پر حکم حرمت لگایا ہے اس لیے قلیل وکثیر کا فرق معتبر نہیں، پس جو حدیث اس کے معارض ہوگی اور اس میں کثیر و قلیل کا فرق بتایا ہوگا، وہ متروک و مردود ہوگی۔(معاذ اللہ)

الجواب و باللہ توفیق الصواب

ہم حنفیہ کی اس وجہِ استدلال میں چند نقوص و معارضات پیش کرتے ہیں۔

اول یہ کہ صاحبِ اصولِ شاشی نے جو اس آیت کو عام کہا ہے، یہ درست نہیں کیونکہ جب صورت استدلال کی یہ ہوئی کہ آیت میں صرف رضاع پر حکم حرمت لگایا گیا ہے اور عدد رضعات کا ذکر نہیں ہے تو آیت وحدیث میں مطلق اور مقید کا مقابلہ ہوا نہ کہ عام وخاص کا۔فافھم

یہ بات صرف ہمیں ہی نہیں کھٹکی بلکہ شارح اصول شاشی صاحب فصول الحواشی کو بھی کھٹکی ہے، چنانچہ وہ اس عبارت مذکور بالا کی شرح کے بعد اخیر میں یوں تنبیہ کرتے ہیں:

”وهذا مثال نادر فتأمل“[1]

یعنی”یہ مثال اجنبی ہے، پس تامل کر لینا چاہیے۔“

اور مفتاح الحواشی میں اس پر حاشیہ دیا ہے:

”قوله:وهذا مثال نادر فتأمل،وجه التأمل أن الإرضاع في النص مطلق، فالتقييد بالكثير يكون تقييد المطلق بالخبر الواحد، لا تخصيص العام فإيراده ههنا غير مستقيم، ويمكن أن يجاب عنه بأنه عام بالنظر إلى المبدء فإيراده في كلا الموضعين مستقيم۔“

”وجہ تامل کی یہ ہے کہ نص (قرآنی) میں ارضاع کا جو ذکر ہے وہ مطلق ہے پس اسے کثیر کے ساتھ مقید کرنا مطلق کو خبر واحد سے مقید کرنا ہے، عام کو خاص کرنا نہیں ہے، پس اس مثال کا اس جگہ وارد کرنا درست نہیں ہے اور ممکن ہے کہ اس (اعتراض) کا یہ جواب دیا

---

[1] فصول الحواشی،ص36

جائے کہ نص باعتبار مبدأ کے عام ہے، پس اس کا دونوں محلوں میں وارد کرنا درست ہے۔''

اگرچہ صاحب مفتاح نے اس کے برمحل ہونے کی ایک وجہ ذکر بھی کردی ہے، لیکن ''یمکن'' کے لفظ سے خود ہی اس کے ضعف کی طرف بھی اشارہ کردیا ہے اور آگے چل کر ان شاء اللہ ہم اس پر کچھ اور بھی لکھیں گے۔ بہرحال شاشی کا اسے عام قرار دینا خود حنفیہ کے نزدیک بھی تسلی بخش نہیں ہے۔

دوم یہ کہ آیت میں اگر عدد رضعات کا ذکر نہیں تو کئی ایک دیگر امور بھی مذکور نہیں ہیں اور وہ حنفیہ کے نزدیک امر رضاع میں حدیث ہی سے ثابت ہو کر قابل اعتبار ہیں۔

پہلا امر یہ ہے کہ آیت میں صرف شیر مادر اور دودھ کی بہن کی حرمت کا ذکر ہے اور دودھ کی جہت سے باقی رشتوں کا حکم مذکور نہیں، اور حدیث میں وارد ہے:

''یحرم من الرضاع مایحرم من النسب''[1]

پس حدیث میں قرآن سے زائد حکم ہے اور اسے حنفیہ نے تسلیم کیا ہے چنانچہ ''بدایہ'' اور اس کی شرح ''ہدایہ'' میں ہے:

''ولا بأمه من الرضاعة، ولا بأخته من الرضاعة، لقوله تعالیٰ:
﴿وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾
ولقوله عليه السلام: يحرم من الرضاع ما يحرم من النسب''[2]

''اور (نکاح حلال نہیں) دودھ کی ماں اور نہ دودھ کی بہن سے قول خداوندی: ﴿وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾ کے حکم سے، اور رسول اللہ ﷺ کے قول ''یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب'' کے حکم سے۔''

یعنی اس حکم سے کہ جو رشتے نسب سے حرام ہیں، وہ رضاع سے بھی حرام ہیں۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ صاحب ہدایہ نے ماں اور بہن کے علاوہ باقی رضاعی رشتوں کی حرمت حدیث سے لی ہے۔ ہاں وہ اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث کئی ایک

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الشهادات، باب الشهادة على الانساب۔۔حدیث: 2645

[2] هداية 288/2، كتاب النكاح، فصل بيان المحرمات

صحابیوں سے مروی ہونے کے سبب مشہور ہے، سو ہم نے عدد رضعات والی حدیث کی نسبت بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ بھی کئی ایک صحابہ سے مروی ہے۔فتساویا

دوسرا امر یہ ہے کہ آیت رضاع میں یہ امر مذکور نہیں ہے کہ دودھ کتنی عمر میں پیا جائے کہ حرمت نکاح کے متعلق اس کا اعتبار کیا جائے۔ہاں یہ بات حدیث میں مذکور ہے، چنانچہ ''بدایہ'' اور اس کی شرح ''ہدایہ'' میں ہے:

''وإذا مضت مدة الرضاع لم يتعلق بالرضاع تحريم لقوله عليه السلام: ''لارضاع بعد الفصال۔''(329/2)

''اور جب رضاع کی مدت گزر جائے،تو رضاع کے متعلق حرمت کا حکم نہیں رہتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس حکم کی وجہ سے کہ دودھ چھڑانے کی عمر کے بعد رضاع کا اعتبار نہیں ہے۔''

فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ نے اس حدیث سے آیت قرآنی پر زیادت کو بلا تردد قبول کرلیا ہے، حالانکہ محدثین کے نزدیک اس حدیث کی سند صحیح مسلم کی حدیث '' لا تحرم المصة ولا المصتان'' کے برابر نہیں ہے، جس کو انہوں نے قرآن پر زائد سمجھ کر متروک ومردود قرار دیا۔معاذاللہ

اس مقام پر ہم صاحب مفتاح کے امکانی جواب کا جواب بھی ذکر کرتے ہیں، جس کا اوپر وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر اس آیت کو بلحاظِ مبدأ کے عام قرار دے کر عام اور مطلق دونوں کی مثال قرار دے دیتے ہیں تو اس عموم میں رضاع کبیر کی شیر مادر بھی داخل ہے، پس اس کو آیت کے حکم میں کیوں نہیں لیا اور کیوں ایسی حدیث سے، جو اخبار آحاد میں ہونے کے علاوہِ اسناد میں بھی رفعاً متفق الصحت نہیں ہے، قرآن پر زیادت قبول کرلی؟ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ

اس تفریق کی وجہ یہ ہے کہ رضاع کبیر کا اعتبار ان کے امام نے کیا تو انہوں نے بھی کرلیا گو متفق الصحت حدیث سے ثابت نہیں ہے، اور عدد رضعات کا اعتبار ان کے امام نے نہ کیا تو انہوں نے بھی نہ کیا، اس کی طرف التفات نہ کیا اگر چہ وہ کئی ایک متفق الصحت احادیث سے ثابت ہے۔

پانچویں مثال

یہ ہے کہ فقہائے حنفیہ کے اصول کا ایک قاعدہ ہے کہ جو صحابی غیر مجتہد ہو، اس کی روایت اگر من کل الوجوہ قیاس کے خلاف ہو تو وہ روایت قابل ترک ہوتی ہے، چنانچہ اصول شاشی میں ہے:

''والقسم الثاني من الرواية هم المعروفون بالحفظ والعدالة دون الاجتهاد والفتوىٰ كأبي هريرة وأنس بن مالك فإذا صحت رواية مثلهما عندك فإن وافق الخبر القياس فلا خفاء في لزوم العمل،وإن خالفه كان العمل بالقياس أولىٰ،مثاله ما روى أبوهريرة: الوضوء مما مسته النار، فقال له ابن عباس: أرأيت لو توضأت بماء سخين أكنت تتوضأ منه؟ فسكت۔ وإنما رده بالقياس إذ لوكان عنده خبر لرواه،على هذا ترك أصحابنا رواية أبي هريرة في مسئلة المسراة وبا عتبار اختلاف الرواية قلنا: شرط العمل بخبر الواحد أن لا يكون مخالفاللكتاب والسنة المشهورة، وأن لايكون مخالفا للظاهر،قال عليه السلام، تكثر لكم الأحاديث بعدي فإذاروي لكم عني حديث فاعرضوه على كتاب الله فما وافق فاقبلوه وما خالف فروده۔'' [1]

''دوسری قسم روایوں کی جو حفظ اور عدالت (تقویٰ) میں تو معروف (مشہور) ہیں، لیکن اجتہاد اور فتویٰ میں معروف نہیں ہیں، مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ پس جب کوئی روایت ان جیسے (اصحاب) سے تیرے نزدیک صحیح ثابت ہو جائے تو اگر وہ حدیث قیاس کے موافق ہو تو اس کے لازم العمل ہونے میں کوئی شک نہیں اور اگر (وہ حدیث) قیاس کے خلاف ہو تو قیاس پر عمل کرنا بہتر ہوگا، مثال اس کی وہ حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھا لینے سے وضو (نیا) کرنا چاہیے، اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر تم گرم پانی سے وضو کرو تو کیا تم پھر اس کی وجہ سے بھی تازہ وضو کرو گے؟ تو ابو ہریرہ (سن کر) چپ ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ ابن عباس نے اس حدیث کو صرف قیاس

---

[1] أصول شاشی ،مطبع مجتبائی دهلی

سے ردّ کیا تھا کیونکہ اگر (اس کے ردّ میں) ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی حدیث ہوتی تو اس کو روایت کرتے، اسی بنا پر ہمارے اصحاب (حنفیہ) نے ابو ہریرہ کی روایت دربارہ مسئلہ مصراۃ کو قیاس کے مقابلہ میں ترک کر دیا۔ اور باعتبار راویوں کے اختلاف کے ہم نے کہا کہ خبر واحد پر عمل کرنے کی شرط یہ ہے کہ وہ قرآن اور سنت مشہورہ کے خلاف نہ ہو (چنانچہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد تمہارے پاس احادیث کثرت سے بیان ہوں گی، پس جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی حدیث پیش ہو تو اسے کتاب کے سامنے کرنا، پس جو اس کے موافق ہوا اسے قبول کر لینا اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دینا۔''

اس عبارت کے متعلق ہم کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں کیونکہ نفس مسئلہ کے علاوہ اس کی زنجیر کی ایک ایک کڑی غلط اور بے قاعدہ ہے۔

1. نفس مسئلہ کی تحقیق کہ آیا حفظ اور عدالت کے علاوہ رواۃ کے لیے فقہ واجتہاد بھی ضروری ہے؟
2. آیا یہ اصول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا وضع کیا ہوا ہے یا کسی اور کا؟
3. حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فقیہ اور مجتہد تھے یا نہ تھے؟
4. حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اعتراض حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ پر کس جہت سے تھا؟ آیا حدیث کو قیاس کے خلاف سمجھا، جیسا کہ مصنف نے سمجھا یا کچھ اور بات تھی؟
5. تحقیق حدیث مصراۃ۔
6. خبر واحد کا مخالف کتاب وسنت مشہورہ وخلاف ظاہر ہونا۔
7. حدیث ''تكثر لكم الأحاديث بعدي۔۔۔الخ کی تحقیق
8. وہ مثالیں جن میں حنفیہ نے خود اس اصول کا خلاف کیا۔

پس ان رؤس ثمانیہ کی تحقیق سے منکشف ہو جائے گا کہ اپنے ایک خوساختہ قاعدہ کی ترویج کے لیے کس قدر بے ضابطگیاں کرنی پڑتی ہیں، جس سے سنت صحیحہ کو بے پرواہی سے ٹال دینا نہایت آسان ہو گیا۔ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہاتھ سے چھوٹے لیکن اپنے بزرگوں کا بنایا ہوا قاعدہ نہ

ٹوٹے۔ اللھم اغفر

امرِ اول: نفسِ مسئلہ کی تحقیق

امر اول کا بیان صاحب نور الانوار کے لفظوں میں یوں ہے:

"والراوي إن عرف بالفقه والتقدم في الاجتهاد كالخلفاء الراشدين والعبادلة كان حديثه حجة يترك به القياس، وإن عرف بالعدالة والضبط دون الفقه كأنس وأبي هريرة إن وافق حديثه القياس عمل به،وإن خالفه لم يترك إلا بالضرورة۔"[1]

"راویِ حدیث اگر فقہ اور اجتہاد میں شہرت و تقدم رکھتا ہو، جیسے خلفاء راشدین اور عبداللہ بن مسعود عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم تو ایسے روای کی حدیث حجت ہوگی، اس حدیث کے ساتھ قیاس متروک کیا جائے گا اور اگر راوی میں عدالت اور ضبط ہو، مگر فقہ نہ ہو، جیسے حضرت انس رضی اللہ عنہ خادمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (جو غیر فقیہ تھے) ایسے روای کی حدیث اگر قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل کیا جائے گا اور اگر مخالف ہوگی تو قیاس نہ چھوڑا جائے گا، سوائے ضرورت خاص کے۔"

ناظرین غور کریں کہ اس شرط کا نتیجہ کیسا بھیانک ہے؟ جو علمائے اصول نے خود ہی بتا دیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے خادمان خاص کو بے فقہ کہہ کر کتنی حدیثوں کو قیاس مجتہد کے مقابلہ میں مسترد کر دیا گیا ہے۔ إنا للہ

امرِ دوم

امر دوم کا بیان اس طرح ہے کہ یہ اصول یعنی اشتراط فقہ روای امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا وضع کیا ہوا نہیں ہے، بلکہ عیسیٰ بن ابان کا ہے، [2] جو امام محمد رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔

---

[1] ص:187

[2] عیسیٰ بن ابان 221ھ میں بصرہ میں فوت ہوئے۔ (لفوائد البهية، ص:16) میر سیالکوٹی رحمہ اللہ

چنانچہ صاحب نورالانوار فرماتے ہیں:

”ثم هذه التفرقة بين المعروف بالفقه والعدالة مذهب عيسىٰ ابن أبان، وتابعه أكثر المتأخرين،وأما عندالكرخي ومن تابعه من أصحابنا فليس فقه الرواي شرطا لتقدم الحديث على القياس،بل خبر كل راو عدل مقدم على القياس، إذا لم يكن مخالفا للكتاب والسنة المشهورة۔“ [1]

”راوی فقیہ اور عادل میں یہ فرق عیسیٰ بن ابان کا مذہب ہے، اور اکثر متأخرین نے اس کی پیروی کی ہے، لیکن امام کرخی رحمہ اللہ اور ہمارے اصحاب میں سے جو اس کے پیرو ہوئے ہیں، ان کے نزدیک راوی کی فقاہت شرط نہیں ہے کیونکہ حدیث قیاس پر مقدم ہے، بلکہ ہر ایک حدیث جو عادل راوی کی روایت سے ہو، قیاس پر مقدم ہے، جبکہ وہ کتاب اللہ اور سنت مشہورہ کے خلاف نہ ہو۔“

اسی طرح رئیس الحنفیہ امام ابن الہمام رحمہ اللہ جو حنفیوں کے نزدیک رتبۂ اجتہاد پر مانے گئے ہیں۔ [2] اپنی کتاب ”تحریر“ میں اور محقق ابن امیر الحاج اس کی شرح ”التقریر والتحبیر“ میں فرماتے ہیں:

”(مسئلة)إذا تعارض الخبر الواحد والقياس،لا جمع بينهما ممكن(قدم الخبر مطلقا عند الأكثر) منهم أبوحنيفة والشافعي وأحمد“۔ [3]

”جب خبر واحد اور قیاس میں ایسا تعارض ہو کہ ان دونوں میں جمع ممکن نہ ہو تو اکثر ائمہ کے نزدیک حدیث کو بہر حال مقدم کیا جائے گا، ان میں سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ ہیں۔“

---

[1] ص:179،180۔نور الانوار بحث السند

[2] شیخ ابن ہمام کا یہ درجہ ”درمختار“ اور اس کی شرح شامی میں مذکور ہے، ہماری اس کتاب ”تاریخ اہلحدیث“ کی کسی گزشتہ فصل میں بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

[3] التقریر:298/2 مطبوعه مصر

اسی طرح کشف الاسرار شرح[1] اصول بزدوی میں اس مسئلہ کے متعلق بسط سے بیان کرنے کے بعد کہا ہے:

"وقد ثبت عن أبي حنيفة رحمه الله أنه قال: ما جاءنا عن الله وعن رسوله عليه السلام فعلى الرأس والعين،ولم ينقل عن أحد من السلف اشتراط الفقه في الراوي فثبت أن هذا القول مستحدث"[2]

"امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ثابت ہو چکا ہے، آپ نے فرمایا کہ جو کچھ ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے پہنچ جائے، وہ سر آنکھوں پر (منظور) ہے، اور سلف (امت) میں سے روای کی فقاہت کا شرط ہونا کسی سے بھی منقول نہیں، پس ثابت ہو گیا کہ یہ قول نیا (بدعت) ہے۔"

کشف الاسرار میں اس مسئلہ کے متعلق جو مبسوط بحث لکھی ہے، اس کا ذکر کر کے بعض مقالات علامہ تفتازانی نے بھی شرح توضیح میں لکھے ہیں، چنانچہ فرمایا:

"وأما ثالثا فلأنه نقل عن كبار الصحابة أنهم تركو القياس بخبر الواحد الغير المعروف بالفقه، وقد نقل صاحب الكشف مايشير إلى أن هذا الفرق مستحدث،وإن خبر الواحد مقدم على القياس من غير تفصيل۔"[3]

"تیسرے اس وجہ سے کہ بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ انہوں نے غیر فقیہ صحابی کی خبر سے قیاس کو ترک کر دیا ہے اور صاحب کشف الاسرار نے ایسا نقل کیا جس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ فرق بدعت ہے اور نیز یہ کہ خبر واحد بہر حال قیاس پر مقدم ہے۔"

اخیر میں ہم امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت نقل کرتے ہیں، جو خاص اس

---

[1] صاحب کشف الاسرار امام ابوحنیفہ کا قول در بارہ متابعت قرآن وحدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ فقاہت روای کی شرط سلف میں سے کسی سے بھی منقول نہیں۔ لہٰذا یہ بات نئی گھڑی ہوئی اور بدعت ہے، پس اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس قول کے قائل نہ تھے۔

[2] کشف الاسرار :703/2 مطبوعہ مصر

[3] تلویح معرّی :5/2

مسئلہ کے علاوہ بعض دیگر اصول حنفیہ کی نسبت بھی ہے کہ ان سب اصول کی روایت حضرت امام ابوحنفیہ رحمہ اللہ اور ان کے بزرگ شاگردوں (امام ابویوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ) سے ہرگز صحیح نہیں ہے اور ان پر محافظت کرنا متقدمین حنفیہ کا دستور نہیں تھا، جیسا کہ امام بزدوی رحمہ اللہ کہتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

”(ومنها) إني وجدت بعضهم يزعم أن بناء الخلاف بين أبي حنفة والشافعي رحمهما الله على هذه الأصول المذكورة في كتاب البزدوي ونحوه، وإنما الحق أن أكثرها أصول مخرجة على أقوالهم، وعندي أن المسئلة القائلة بأن الخاص مبين، ولا يلحقه البيان، وإن الزيادة نسخ، وإن العام قطعی كالخاص، وأن لا ترجيح بكثرة الرواة، وأنه لا يجب العمل بحديث غير الفقيه إذا انسد باب الرأي، وأن لاعبرة بمفهوم الشرط والوصف أصلا، وأن موجب الأمر هو الوجوب البتة، وأمثال ذلك أصول مخرجة على كلام الأئمة، وإنها لا تصح بها رواية عن أبي حنيفة وصاحبيه، وأنه ليست المحافظة عليها والتكلف في جواب مايرد عليها من صنائع المتقدمين في استنباطاتهم كما يفعله البزدوى وغيره أحق من المحافظة على خلافها والجواب عما يرد عليه۔“ [1]

”ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں نے بعض کو پایا جو یہ گمان کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے اختلاف کی بنا ان اصول پر ہے جو کتاب بزدوی وغیرہ میں مذکور ہیں، اور حق بات یہ ہے کہ اکثر کی ان اصول میں سے ان کے اقوال سے تخریج کی گئی ہے اور یہ میرے نزدیک یہ مسئلہ کہ خاص بذات خود واضح ہوتا ہے، اس کو بیان کی ضرورت نہیں ہوتی، اور یہ کہ زیادت بھی ایک قسم کا نسخ ہے اور یہ کہ عام مثل خاص کے قطعی ہوتا ہے اور یہ کہ راویوں کی کثرت سے ترجیح نہیں ہوسکتی، اور نیز یہ کہ جب رائے اور قیاس کا دروازہ بند ہوجائے تو غیر فقیہ (صحابی) کی روایت پر عمل کرنا واجب نہیں اور یہ کہ مفہوم شرط اور

[1] حجة الله البالغة، طبع مصري: 1/159-160

وصف کا ہرگز اعتبار نہیں، اور یہ کہ امر کا تقاضا ضرور ضرور وجوب ہی ہے۔ اور مثل ان کے دیگر اصول ایسے ہیں جن کی ائمہ کے کلام سے تخریج کی گئی ہے اور ان اصول کی روایت امام ابو حنیفہ اور آپ کے صاحبین (امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ) سے صحیح طور پر ثابت نہیں اور یہ کہ ان اصول کی نگہبانی کرنا اور ان اعتراضوں کے جواب میں جو ان پر وارد ہوتے ہیں، تکلف کرنا، جس طرح کہ بزدوی رحمہ اللہ وغیرہ کرتے ہیں، اپنے استنباطوں میں متقدمین کا دستور نہیں تھا اور وہ ان کے خلاف پر محافظت کرنے اور ان کے جواب سے جو ان پر وارد ہوتے ہیں، زیادہ حقدار نہیں ہیں۔''

ان حوالجات سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ محدثین کے علاوہ خود حضرات حنفیہ بھی صریحاً لکھتے ہیں کہ اشتراط فقہ راوی کا اصول حضرت ابو حنیفہ کا مقرر کردہ نہیں ہے، بلکہ عیسیٰ بن ابان کا ایجاد کردہ ہے اور اس سے پیشتر کسی بھی امام نے یہ بات نہیں کی۔

اب ہم اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ عیسیٰ بن ابان نے یہ اصول کیوں وضع کیا؟

عیسیٰ بن ابان ابتداء میں اہلحدیث تھے۔ امام محمد رحمہ اللہ کی صحبت میں رہ کر ان سے متاثر ہو گئے۔ [1] خیالات میں انقلاب ہوا، تو اختلاف کے وقت نئے اختیار کردہ طریق کے مقابلہ میں جو روایات آئیں، ان کی تحقیقات میں اس شرط کا بڑھانا ضروری خیال کیا کہ جو صحابہ غیر فقیہ ہوں باوجود ان کے صادق و عادل و ضابط ہونے کے قیاس [2] (اپنی رائے) کے مقابلہ میں ان کی روایت کو ٹھکرا دیا جائے۔ اللھمّ احفظنا

---

[1] عیسیٰ بن ابان کے اس تبدیلی طریق کا ذکر ''الفوائد البھیة'' میں موجود ہے۔

[2] قیاس سے مراد ہم نے عیسیٰ بن ابان کی ذاتی رائے اس لیے بیان کی ہے کہ حقیقت میں کوئی بھی صحیح حدیث عقل صحیح اور قیاس شرعی کے خلاف نہیں ہوتی، جو کچھ اختلاف ہوتا ہے وہ قیاس کرنے والے شخص کی رائے سے ہوتا ہے، سو حدیث کا مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ وہ کسی خاص شخص کے قیاس کے خلاف ہونے کے سبب درجۂ اعتبار سے ساقط ہو جائے۔ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا

امرِ سوم

امر سوم یہ کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فقیہ و مجتہد تھے یا عامی؟ سو اس کا بیان اس طرح ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مجتہد ہونے سے انکار کرنا، علم حدیث و روایت کے مطالعہ کی کمی کا نتیجہ ہے، ورنہ جو شخص اسفارِ حدیث پر نظر رکھتا ہو، اسے بغیر تسلیم کے چارہ نہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فقہائے صحابہ میں سے تھے، تمام اسباب اجتہاد ان کو قدرت نے عطا کیے تھے اور وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت میں برابر صاحب فتویٰ اور صاحب اجتہاد تھے۔ اس بات کا اقرار خود حنفیہ شراح اصول کو بھی ہے، جنہوں نے علم حدیث پڑھا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایات و اجتہادات کو نظر غور سے دیکھا، چنانچہ ہم بعض کی عبارتیں نقل کرتے ہیں۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ جو متاخرین حنفیہ میں درجۂ اجتہاد تک پہنچے اور مذہب حنفی کے خاص الخواص حامیوں میں سے ہیں فتح القدیر شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں:

"والمائة الألف الذين توفي عنهم صلى الله عليه وسلم لا يبلغ عدة المجتهدين الفقهاء منهم أكثر من عشرين كالخلفاء والعبادلة وزيد بن ثابت و معاذ بن جبل وأنس وأبي هريرة وقليل ، والباقون يرجعون إليهم ويستفتون منهم۔"[1]

"اور ایک لاکھ اصحاب جن کو چھوڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوت ہوئے، ان میں سے مجتہدین کی گنتی بیس سے زیادہ تک نہیں پہنچتی، مثلاً خلفاء اربعہ اور عبادلہ اور زید بن ثابت اور معاذ بن جبل اور انس اور ابو ہریرہ اور کچھ اور تھوڑے سے، اور باقی سب کا رجوع انہیں (مجتہدین صحابہ) کی طرف تھا اور وہ انہی سے فتویٰ پوچھا کرتے تھے۔"

اسی طرح علامہ عبدالعزیز بخاری حنفی رحمہ اللہ نے تو "کشف الاسرار شرح اصول بزدوی" میں نہایت زور سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا مجتہد ہونا لکھا ہے اور اس کا انکار کرنے والے کی تردید کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

[1] فتح القدير شرح هداية نو لكشورى :2/141

”على أنا لا نسلّم أن أبا هريرة رضي الله عنه لم يكن فقيها بل كان فقيها ولم يعدم شيئا من أسباب الاجتهاد وقد كان يفتي في زمان الصحابة، وما كان يفتي في ذلك الزمان إلا فقيه مجتهد، كان من عليّة أصحاب رسول الله ﷺ رضي الله عنهم، وقد دعا النبي ﷺ له بالحفظ فاستجاب الله تعالىٰ له فيه حتى انتشر في العالم ذكره وحديثه، وقال إسحاق الحنظلي: ثبت عندنا في الأحكام ثلاثة آلاف من الأحاديث روى أبوهريرة منها ألفا وخمسائة، وقال البخاري: روى عنه سبعمائة نفر من أولاد المهاجرين والأنصار، وقد روى جماعة من الصحابة عنه فلا وجه إلى رد حديثه بالقياس۔“[1]

”(اس کے بعد یہ کہ) ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فقیہ نہ تھے بلکہ (ہم کہتے ہیں) کہ وہ فقیہ تھے اور اسبابِ اجتہاد میں سے کوئی سبب بھی ایسا نہ تھا جو ان میں موجود نہ ہو، اور وہ صحابہ کے زمانہ میں فتویٰ دیا کرتے تھے اور اس زمانہ میں سوائے مجتہد کے کوئی فتویٰ نہ دیا کرتا تھا، اور آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عالی قدر اصحاب میں سے تھے۔ اللہ ان سب سے راضی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان (ابو ہریرہ) کے حق میں حافظہ کی دعا کی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں آپ کی دعا قبول فرمائی اور ساری دنیا میں ان کا ذکر اور ان کی حدیث پھیل گئی۔ امام اسحاق حنظلی نے کہا کہ ہمارے پاس (مسائل) احکام میں کل تین ہزار حدیثیں ثابت ہوئی ہیں، جن میں سے ڈیڑھ ہزار (صرف) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہیں۔ اور امام بخاری نے کہا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مہاجرین اور انصار کی اولاد میں سے سات سو شخصوں نے روایت کی اور صحابہ کی (بھی) ایک جماعت نے ان سے روایت کی، پس ان کی حدیث کو قیاس سے رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔“

ان حوالہ جات سے معلوم ہو گیا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، معمولی نہیں بلکہ خاص درجہ کے مجتہد

---

[1] کشف الأسرار: 703/2 مطبوعہ مصر

تھے، اور جن حنفیوں نے آپ کے اجتہاد کا انکار کیا ہے، علم حدیث میں فرومایہ ہونے کے سبب کیا ہے؟

امرِ چہارم

امر چہارم یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے اعتراض کی تحقیق یوں ہے کہ نہ تو انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ سمجھ کر اعتراض کیا اور نہ اس حدیث کو خلافِ قیاس جان کر رد کیا۔ یہ بات تو کسی عام صحابی سے بھی بعید ہے۔ چہ جائیکہ ابن عباس جیسے جلیل القدر متبع سنت کی نسبت ایسا خیال کیا جائے۔ حاشاوکلا، توبہ استغفر اللہ

کشفِ حقیقت

اصل بات یہ ہے کہ اس حدیث کے متعلق دونوں صحابیوں (حضرت ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما) میں فہمِ مطلب میں اختلاف تھا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کو ظاہر پر حمل کرتے تھے یعنی وضو سے وضوئے متعارف مراد لیتے تھے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس جگہ وضو سے صرف ہاتھ اور منہ کا اندرونی حصہ صاف کرنا یعنی کلی کرنا مراد لیتے تھے، اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے نظائر سے سمجھایا کہ جب گرم پانی وغیرہ سے وضو متعارف جائز ہے تو آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو کس طرح ٹوٹ جائے گا؟ لہٰذا اس حدیث میں وضو سے مراد وضوئے متعارف نہیں، بلکہ صرف ہاتھ (جس سے کھایا) اور منہ (جس میں کھایا) ان ہر دو کو صاف کرنا یعنی دھو لینا مراد ہے اور بس۔ جو کچھ ہم نے فہم مطلب کے اختلاف کی نسبت لکھا، وہ بعد کے علماء میں بھی برابر چلا آیا، چنانچہ لغتِ حدیث ''نہایہ ابن اثیر'' میں لفظ ''وضوء'' کے ذیل میں لکھا ہے:

''وقد يراد به غسل بعض الأعضاء، ومنه حديث: توضؤا مما غيرت النار، أراد به غسل الأيدی والأفواه من الزهومة، وقيل: أراد به وضوء الصلوٰة، وذهب إليه قوم من الفقهاء''[1]

یعنی'' اور کبھی وضو سے صرف بعض اعضاء کا دھونا مراد ہوتا ہے اور اس معنی میں حدیث

---

[1] نهاية لابن الأثير (جلد4) بذیل لفظ وضو

" توضؤا مما غيرت النار"ہے۔یعنی یہ حدیث کہ اس شے کے کھانے سے وضو کرو جسے آگ نے متغیر کیا ہو،اس حدیث میں "توضؤا" سے مراد ہاتھ اور منہ کا دھونا ہے بوجہ چکنائی کے۔اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد نماز کا وضو ہے اور اس طرف بھی فقہاء کی ایک جماعت گئی ہے۔"

حضرت ابن عباس نے اس حدیث میں جو معنی مراد لیے ہیں،ان کی تائید دیگر احادیث مرفوعہ سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ سنن ابی داؤد میں ہے: "باب الوضوء من اللبن۔"اس لفظ میں وضو صاف لکھا ہے، پھر اس کے بعد حضرت ابن عباس کی روایت سے ذیل کی روایت ذکر کی ہے:

"عن ابن عباس أن النبي ﷺ شرب لبناً فدعا بماء فتمضمض ثم قال: إن له دسماً۔"[1]

کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دودھ نوش فرمایا تو پانی طلب کیا، پس کلی کی اور فرمایا اس میں چکنائی ہوتی ہے۔"

اس روایت میں صاف مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دودھ پیا، بعد ازاں کلی کر لی اور فرمایا کہ اس میں چکنائی ہوتی ہے۔گویا کلی کرنے کی وجہ سمجھا دی۔

اس سے زیادہ یہ کہ وضو کا لفظ محض ہاتھ دھونے اور کلی کرنے کے لیے خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے دیگر احادیث سے بھی ثابت ہے، چنانچہ مشکوٰۃ میں بحوالہ ترمذی و ابو داؤد، حضرت سلمان فارسی سے روایت ہے:

"فقال رسول الله ﷺ بركة الطعام الوضوء قبله والوضوءبعده"[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:"کھانا کھانے سے پہلے بھی وضو کر لینے اور اس کے پیچھے بھی وضو کر لینے سے کھانے میں برکت ہوتی ہے۔"

اس حدیث کے ذیل میں شراح حدیث وضو سے مراد "غسل اليدين والفم"[3] لکھتے ہیں۔

---

[1] سنن ابی داؤد،کتاب الطهارة،باب في الوضوء من اللبن،حديث:196

[2] رواه الترمذی وأبو داؤد ، مشكوٰة كتاب الأطعمة

[3] مذکورہ بالا حاشیہ بین السطور نیز حاشیہ منقول از مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، از ملا علی قاری حنفی (میر سیالکوٹی رحمہ اللہ)

اس سے بھی زیادہ یہ کہ ترمذی میں حضرت عکراش سے ایک روایت کے ضمن میں ہے:

”ثم أتينا بماء فغسل رسول الله ﷺ يديه ومسح ببَلَل كفيه وجهه وذراعيه ورأسه،وقال يا عكراش! هذا الوضوء مما غيرت النار۔“[1]

”ہم پانی لائے تو آنحضرت ﷺ نے دونوں ہاتھ دھوئے اور اپنے ہاتھوں کی تری سے منہ اور دونوں بازؤں اور سر کو چھوا اور فرمایا: اے عکراش! آگ لگی ہوئی چیز سے وضو کرنا یہی ہے۔“

اس حدیث سے صاف معلوم ہوگیا کہ وضو کا لفظ اس طہارت کے علاوہ بھی بولا جاتا ہے، جو”نماز“ کے لیے مخصوص ہے۔

پس اسی طرح حضرت ابن عباس آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے کی حدیث میں ”وضو“ کے لفظ کو صرف کلی کرنے اور ہاتھ دھولینے پر محمول کرتے تھے، لہٰذا یہ کہنا کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ جان کر اور ان کی روایت کو خلافِ قیاس جان کر رد کر دیا تھا، درست نہ تھا۔ وللہ الحمد

پانچواں امر، تحقیق حدیثِ مصراۃ

”عن أبي هريرة أن النبى ﷺ قال: لا تصرّوا الإبل والغنم، فمن ابتاعها بعد ذلک فهو بخير النظرين بعد أن يحلبها إن رضيها أمسكها، وإن سخطها ردها وصاعا من تمر۔“[2]

”بروایت بخاری ومسلم حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اونٹنی اور بکری کے تھنوں میں دودھ بند نہ کرو اور جو ایسی حالت کے بعد اس جانور کو خریدے تو اسے دونوں امروں میں سے ایک کا اختیار ہے، بعد اس کے کہ اسے دوھ (کر آزما) لے

---

[1] رواه الترمذی، ابواب الأطعمة باب ماجاء فی الوضوء قبل الطعام وبعده حديث: 1846،
وابو داؤد، اول كتاب الأطعمة باب فی غسل اليد قبل الطعام، حديث: 3761

[2] صحيح بخاری، كتاب البيوع، باب النهی للبائع أن لا يحفل الإبل حديث: 2148، صحيح مسلم كتاب البيوع، باب تحريم بيع الرجل على بيع أخيه، حديث: 1515

اگر اسے پسند ہو تو رکھ لے اور اگر ناپسند ہو تو واپس کر دیوے اور ایک صاع[1] کھجوریں (ساتھ دیوے)۔''

تصریہ سے یہ مراد ہے کہ جانور کے تھنوں میں دودھ روک رکھا جائے، بعض لوگ ایسا کرتے ہیں تاکہ اس جانور کا دودھ زیادہ معلوم ہو اور خریدار اسے شوق سے خرید لے، چونکہ اس میں دھوکہ پایا جاتا ہے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے روکا اور فرمایا کہ جو شخص ایسا جانور خریدے تو اسے واپسی کا اختیار ہے، اور یہ بھی فرمایا کہ اگر واپس کرے تو اس دودھ کے عوض جو اس نے دوھ کر حاصل کیا ہے، ایک صاع کھجوریں بھی ساتھ دیوے۔ اس حدیث کو امام بخاری اور مسلم کے علاوہ دیگر ائمہ حدیث نے بھی روایت کیا ہے۔ مثلاً امام مالک، امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام نسائی رحمہم اللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث اپنے مطلب میں بالکل صاف ہے اور اس کی حکمت اور معقولیت عیاں ہے کہ آپ دھوکے فریب کے سودے سے منع فرماتے ہیں اور یہ حکم آپ کے منصب ﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾[2] (سورہ جمعہ) کے بالکل مناسب ہے۔

اس حدیث میں دو حکم ہیں: ''خیارِ رد'' یعنی واپس کر دینے کا اختیار، اور واپسی پر دودھ کے عوض ایک صاع کھجور کا ساتھ ادا کرنا۔

حنفیہ کرام رحمہم اللہ نے ان دونوں باتوں سے انکار کیا ہے نہ تو وہ واپسی کے اختیار کے قائل ہیں اور نہ طعام (کھجور) کے، کیونکہ حدیث ان کے نزدیک قیاس کے برخلاف ہے، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور وہ ان کے نزدیک مجتہد نہیں تھے، اور غیر مجتہد صحابی کی جو روایت خلافِ قیاس ہو، وہ ان کے ہاں مقبول نہیں۔

---

[1] ایک صاع عراقی کا وزن چار سیر انگریزی کے برابر ہوتا ہے اور حجازی صاع کا وزن تقریباً پونے تین سیر کے برابر، امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے صدقۂ فطر میں عراقی صاع چھوڑ کر امام مالک رحمہ اللہ کی موافقت میں حجازی صاع کو اختیار کیا تھا۔ نافع کبیر حاشیہ جامع صغیر از مولانا عبدالحی لکھنوی (ص25) نوٹ نمبر (8 (میر سیالکوٹی رحمہ اللہ)

[2] یعنی سورہ جمعہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا رسول لوگوں کا تزکیہ کرتا ہے، ایسے ایسے احکام سکھاتا ہے، جس سے لوگ اعتقادی واخلاقی و عملی خباثتوں اور ظاہری اور باطنی گندگیوں سے پاک ہو جائیں، نیز اپنی پاک مصاحبت سے ان لوگوں کو قلبی اور عملی آلودگیوں سے پاک کرتا ہے۔ (میر سیالکوٹی رحمہ اللہ)

اس حدیث کی صحت میں جو امام بخاری اور مسلم کی متفقہ روایت سے ہو، کیا کلام ہوسکتا ہے؟
حافظ ابن حجر رحمہ اللہ صحیح حدیث کے مراتب میں مرتبۂ اولیٰ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

”ویلتحق بهذا التفاضل ما اتفق الشیخان علی تخریجه“[1]

یعنی مرتبہ اولیٰ کی فضیلت میں وہ احادیث بھی شامل ہیں، جن کو شیخین (امام بخاری ومسلم) نے بالاتفاق روایت کیا ہو۔“

اور مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی حنفی اس کے حاشیہ میں بین السطور میں ”شیخان“ کے لفظ پر لکھتے ہیں: ”البخاری ومسلم“

ہر چند کہ یہ حدیث درجہ اولیٰ میں ہے لیکن تقلید ایک ایسی زبردست تحریک ہے کہ اس کا بند دلائل کی قوت قاہرہ سے بھی بمشکل ٹوٹتا ہے۔

اسناد کی رو سے اس حدیث میں کوئی جرح نہیں ہوسکتی تھی، اصول محدثین کے رو سے اس میں کوئی قدح نہیں تھی، اس لیے مذہبی پاسداری سے اس سنت صحیحہ کے رد کرنے میں اتنے حیلے تراشے گئے کہ اس حدیث کے راویوں کی جلالت قدر پر نظر رکھنے والا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حکیمانہ وعادلانہ تعلیم کی خوبی کو نظر عزت وقدر دانی سے دیکھنے والا اور اصول تمدن میں اس حکم کے نہایت ہی مفید ہونے اور عام لوگوں کو دھوکے فریب کے ضرر سے بچانے بلکہ خود دھوکہ دینے والے کو باطنی خباثت اور اخلاقی بدباطنی سے پاک کرنے کو سمجھنے والا، منصف مزاج انسان حیران رہ جاتا ہے کہ الٰہی کیا دنیا میں اس دل و دماغ کے آدمی بھی ہیں، جو اس حکم کو خلافِ قیاس کہہ کر رد کر دیتے ہیں؟

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا۔

پہلے ہم اس حدیث (مصراۃ) کے متعلق محدثین کی بعض عبارتیں لکھتے ہیں ان سے آپ کو پتا لگ جائے گا کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی قائل اور اس پر دل وجان سے عامل کون ہیں؟ اور اسے صرف اپنی موافقت ومطلب برآری کے وقت محض تائیدی طور پر نقل کرنے والے کون ہیں۔

---

[1] شرح نخبہ، ص: 27

❶ خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر ''فتح الباری'' میں فرماتے ہیں:

''وقد أخذ بظاهر هذا الحديث جمهور أهل العلم، وأفتى به ابن مسعود وأبو هريرة، ولا مخالف لهم من الصحابة، وقال به من التابعين ومن بعدهم من لا يحصى عدده۔''

''اس حدیث کے ظاہر کو جمہور اہل علم نے لیا ہے اور اسی کے مطابق ابن مسعود اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم (صحابیوں) نے فتویٰ دیا، اور جماعت صحابہ میں سے ان کا کوئی بھی مخالف نہیں اور اسی کے مطابق تابعین اور ان کے بعد ائمہ میں سے اتنی تعداد کے ائمہ نے کہا جن کی گنتی نہیں ہوسکتی۔''

❷ ''وقال ابن السمعاني في الاصطلام: التعرض إلى جانب الصحابة علامة على خذلان فاعله، بل هو بدعة وضلالة، وقد اختص أبو هريرة بمزيد الحفظ لدعاء رسول الله ﷺ له۔''

''ابن سمعانی نے 'اصطلام' میں کہا کہ صحابہ کی جانب تعرض کرنا اس کے کرنے والے کے لیے خذلان (خدا کا ساتھ نہ ہونے) کی علامت ہے، بلکہ یہ بات ایک بدعت اور گمراہی ہے، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی برکت سے زیادہ حفظ سے مخصوص تھے۔''

❸ ''وقال ابن عبدالبر هذا الحديث مجمع على صحته وثبوته من جهة النقل واعتل من لم يأخذ به بأشياء لا حقيقة لها۔''

''امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا کہ اصول روایت کے رو سے اس حدیث کی صحت وثبوت پر (ائمہ حدیث کا) اجماع ہے، اور اس شخص نے جس نے اسے تسلیم نہیں کیا، ایسے عذر کیے ہیں، جن کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔''

❹ ''والكتاب والسنة في الحقيقة هما الأصل، والآخران مردودان إليهما، السنة أصل، والقياس فرع، فكيف يرد الأصل بالفرع، بل الحديث الصحيح أصل

بنفسه فكيف يقال :إن الأصل يخالف نفسه"

''حقیقت میں قرآن وحدیث ہی اصول (شرع) ہیں اور باقی دونوں (اجماع وقیاس) کو انہیں کی طرف لوٹایا جاتا ہے، پس سنت (رسول اللہ ﷺ) بالاستقلال اصل ہے اور قیاس فرع ہے، پس اصل کو فرع سے کس طرح رد کر سکتے ہیں بلکہ حدیث تو بذاتِ خود ایک اصل ہے، پس یہ قول کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ کوئی اصل اپنے آپ کے خلاف ہو۔''

5 " قال ابن عبدالبر :هذا الحديث أصل في النهي عن الغش، وأصل في ثبوت الخيار لمن دلس عليه بعيب، وأصل في أنه لا يفسد أصل البيع، وأصل في أن مدة الخيار ثلاثة أيام، وأصل في تحريم التصرية وثبوت الخيار بها." [1]

حافظ ابن عبدالبر نے کہا کہ یہ حدیث کھوٹ اور دغا کی ممانعت کے متعلق اصل ہے، نیز اس شخص کی واپسی کے اختیار کے لیے اصل ہے، جس پر فریب کی رو سے عیب ظاہر نہ کیا گیا ہو، نیز اس بارے میں اصل ہے کہ بیع تمام ہوجاتی ہے اور فاسد نہیں ہوتی۔ [2] نیز اس امر میں اصل ہے کہ واپسی کے اختیار کی مدت تین دن ہیں۔ [3] نیز تصریہ کی حرمت اور اس کی وجہ سے ثبوت خیار میں اصل ہے۔''

6 اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ اسی حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں:

"واعتذر بعض من لم يوفق للعمل بهذا الحديث قاعدة من عند نفسه فقال : كل حديث لا يرويه إلا غير الفقيه إذا انسد باب الرأي فيه يترك العمل به." [4]

''اور بعض نے جن کو (جناب خداوندی سے) اس حدیث پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ملی، اپنے پاس سے ایک قاعدہ گھڑ کر عذر کر دیا ہے کہ جو حدیث کوئی غیر فقیہ راوی روایت کرے، جب اس سے اس کے متعلق قیاس کا دروازہ (بالکل) بند ہوجاتا ہو تو اس حدیث

---

[1] فتح الباری مطبوعه دهلی :373/3، زیر احادیث ممانعت تصریہ

[2] کیونکہ اگر بیع تمام نہ ہوتی تو آپ ﷺ رکھ لینے کا اختیار نہ دیتے۔

[3] کیونکہ مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ واپسی کا اختیار تین دن تک ہے۔

[4] حجة الله البالغة، طبع مصری :103/2

پر عمل نہیں کیا جائے گا۔"

ان عبارتوں سے واضح ہے کہ محدثین کو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتنی رعایت اور حمایت ہے کہ اس کی خلاف ورزی کرنے والے پر حلیم سے حلیم اور متین[1] سے متین شخص کی طبیعت بھی ہل گئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک یہ بھی سوچنے کا مقام ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بعض شاگرد مثلاً امام زفر رحمہ اللہ بھی اس امر میں محدثین کے موافق ہیں، اور بموجب ایک روایت کے امام ابو یوسف بھی اس امر میں محدثین کے موافق ہیں۔ چنانچہ علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ نے اسے خود لکھا ہے اور علامہ عبدالعزیز بخاری نے کشف الاسرار شرح اصول بزدوی میں اس کا ذکر کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"ونقل عن أبي يوسف في بعض أماليه أنه أخذ بحديث المصراة وأثبت الخيار للمشتري"[2]

اس کے بعد ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھا صحابی غیر فقیہ کی روایت کو تو آپ نے اس کے مخالف قیاس ہونے کی صورت میں متروک العمل قرار دیا ہے، لیکن جب آپ فقیہ و مجتہد صحابی کی روایت کو ہر چند کہ وہ مخالف قیاس ہو تسلیم کرتے ہیں اور قیاس کو ترک کر دیتے ہیں تو اگر حضرت ابو ہریرہ کی موافقت میں ایک اعلیٰ درجہ کا مجتہد صحابی بھی یہی فتویٰ دیوے تو پھر تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بے سمجھی سے روایت نہیں کر رہے اور نیز یہ کہ ان کی یہ روایت قیاس کے بھی خلاف نہیں ہے۔

امام بخاری بھی کتنے دور اندیش ہیں کہ جو کچھ آپ (حنفیہ) پیچھے کہنے والے ہوتے ہیں، وہ ان کو پہلے ہی کھٹک جاتا ہے، لیجیے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ حضرت عبداللہ بن مسعود کا فتویٰ نقل کرتے ہیں، جن کی فقاہت و روایت کا اعتبار حنفی مذہب میں خصوصیت سے ہے۔

"عن عبدالله بن مسعود قال: من اشترى شاة محفلة فردها فليرد معها صاعا من تمر، ونهى النبي صلى الله عليه وسلم أن تلقى البيوع۔"[3]

[1] مراد حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ ہیں (میر سیالکوٹی رحمہ اللہ)

[2] 703/2

[3] صحيح بخاري بمع فتح الباری: 373/3، مطبوعہ دهلی

''عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں: جس نے ایسی کوئی بکری خریدی جس کا دودھ اس کے تھنوں میں روکا ہوا تھا تو اگر وہ شخص اس بکری کو واپس کرے تو اس کے ساتھ ایک صاع تمر کھجور بھی دیوے اور آنحضرت ﷺ نے اس بات سے بھی منع کیا ہے کہ (باہر سے) مال (لانے والوں) کو آگے سے جا کر ملیں (اور ان کی شہر کے نرخ سے ناواقفی کی حالت میں خرید لیں)۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس روایت کی نسبت فرماتے ہیں:

''وأظن أن لهذه النكتة أورد البخاري حديث ابن مسعود عقب حديث أبي هريرة إشارة منه إلى أن ابن مسعود قد أفتى بوفق حديث أبي هريرة، فلولا أن خبر أبي هريرة في ذلك ثابت لما خالف ابن مسعود القياس الجلي في ذلك۔''

''میرے خیال میں امام بخاری رحمہ اللہ حضرت ابن مسعود کی حدیث حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے پیچھے اس نکتہ کے لیے لائے ہیں کہ اس بات کی طرف اشارہ کریں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے موافق فتویٰ دیا ہے، پس اگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح وثابت نہ ہوتی تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس بارے میں قیاس جلی کے خلاف نہ کرتے۔''

اس امر کی طرف حضرت شاہ صاحب بھی راوی غیر فقیہ والے عذر کا رد کرتے ہوئے اشارہ کرتے ہیں۔

''وهذه القاعدة علىٰ ما فيها لا تنطبق على صورتنا هذه لأنه أخرجه البخاري عن ابن مسعود أيضاً ،وناهيك به۔''[1]

''اور یہ قاعدہ بذاتِ خود غلط ہونے کے علاوہ ہماری اس پیش افتادہ صورت پر منطبق بھی نہیں ہوتا، کیونکہ اس حکم کو امام بخاری نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے اور تیرے لیے یہ

[1] حجة الله البالغة،۔طبع مصرى:103/2

کافی ہے۔''یعنی ابن مسعود کا مجتہد ہونا مسلّم کل ہے، اس میں کسی کو کلام نہیں۔

حضرت ابن مسعود کی روایت کے متعلق ہم اس مقام پر ایک اور تحقیقی نکتہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ دو حال سے خالی نہیں یا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا اور اس وقت اس کو آپ کی طرف مسند کر کے روایت نہیں کیا یا وہ اپنے اجتہاد و قیاس سے کہتے ہیں۔

شق اول یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سن کر کہا ہو تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے متعلق جو عذر تھا وہ جاتا رہا، کیونکہ ابن مسعود بالاتفاق مجتہدین صحابہ کے ان چند افراد میں سے ہیں جن کا شمار انگلیوں پر ہوسکتا ہے۔ اور علامہ ابن ہمام کی عبارت سے ان کے اسماء اوپر منقول ہو چکے کہ بیس سے زیادہ نہیں ہیں۔

اگر شق ثانی ہے تو بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی نسبت یہ عذر جاتا رہا کہ وہ قیاس کے خلاف ہے کیونکہ اگر قیاس کے خلاف ہوتی تو ایسے جلیل القدر صحابی مجتہد کا قیاس اس کے موافق کیوں پڑتا؟

لیکن ہماری تحقیق یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اجتہاد سے فتویٰ نہیں دیتے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سن کر کہتے ہیں اور آپ کی طرف اسناد نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ بعض دیگر صحابہ بھی بالخصوص ابن مسعود کی بھی عادت سے پایا گیا ہے کہ وہ بعض اوقات مسئلہ کا ذکر کر دیتے تھے اور اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف مسند نہیں کرتے تھے، حالانکہ وہ حدیث مرفوع و مسند ہوتی تھی، اور اس امر کو علمائے حدیث بخوبی پہچانتے ہیں اور چنداں محتاج ثبوت و بیان نہیں، چنانچہ اصول بزدوی میں ہے:

''وقد كانوا يسكتون عن الإسناد۔''[1]

اور صحابہ کبھی اسناد سے خاموش رہتے تھے۔''

ہماری تحقیق کی بنا دو باتوں پر ہے:

اول اس پر کہ اس میں ''صاعاً من تمر'' بھی موجود ہے، جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ہے اور یہ بیان مقدار ہے اور مقادیر کا تقرر قیاس سے نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک شرعی حکم ہے جس کا تقرر صرف اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق ہے۔ قیاس سے حکم شرعی کی علت و حکمت کو سمجھا کرتے ہیں مقادیر

[1] بحث تقليد الصحابی: ج3

شرعیہ اور احکامِ شرع مقرر نہیں کیے جاتے پھر تو منصب تشریع میں شرکت ہو جائے گی۔نعوذ باللہ من ذلک

چنانچہ اس اصولی مسئلہ کو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ''حجۃ اللہ'' میں بالاستقلال نہایت مبسوط اور مدلل بیان کیا ہے۔(جلد اول، مطبوعہ مصر)

پس جس طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سن کر اس مسئلہ کو ذکر کیا، اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے سن کر ذکر کیا۔ایک نے مسند ذکر کیا ور ایک نے مسند ذکر نہیں کیا۔

مسئلہ ایک ہی ہے اور وہ قیاس کے متعلق نہیں۔اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہی مسئلہ ابن ماجہ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے رفعاً بھی مروی ہے۔گو رفع کی اس تصریح میں محدثین کو کلام ہے اور اسی لیے امام المحدثین امام بخاری نے اسے اپنی صحیح میں رفعاً روایت نہیں کیا، لیکن علامہ عینی حنفی، باوجود مذہب حنفی کی بے حد حمایت کرنے کے، اسے تسلیم کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:

”وقد نهى النبي ﷺ عن التصرية، وروى ابن ماجه من حديث ابن مسعود أنه قال: أشهد على الصادق المصدوق أبي القاسم ﷺ أنه قال: بيع المحفلات خلابة، ولا تحل الخلابة لمسلم، انتهى، قلت: والكل مجمعون على أن التصرية حرام وغش وخداع۔“ [1]

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تصریہ سے منع فرمایا اور امام ابن ماجہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انھوں نے کہا ہے میں صادق مصدوق ابو القاسم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر (دل وجان سے) شہادت دیتا ہوں کہ آپ نے فرمایا: محفلات (وہ جانور جن کا دودھ تھنوں میں روک رکھا جائے) کی بیع (ایک قسم کا) فریب ہے اور کسی مسلمان کے لیے فریب حلال نہیں (علامہ عینی کہتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ اس امر پر سب متفق ہیں کہ تصریہ حرام ہے اور دغا اور فریب ہے۔''

[1] عمدة القاری للعینی: 521/5

دوسری بات جس پر ہماری تحقیق کی بنا ہے یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کا اخیر حصہ صحیح بخاری میں بھی مرفوع ہے وہ یہ ہے:

"ونهي النبي ﷺ عن تلقي البيوع"

"اور منع کیا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کو آگے سے جا کر ملنے سے جو باہر سے بیع کی چیزیں لاویں۔"

جس طرح یہ حکم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کا ایک ٹکڑا ہے، اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا بھی ایک ٹکڑا ہے، یعنی جس طرح حضرت ابن مسعود کی روایت میں "بیع مصراۃ"، یعنی دودھ بند کیے ہوئے جانور کی بیع اور ممانعت تلقی رکبان دو امروں کی نسبت حکم ہیں، اسی طرح حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں بھی یہ دونوں امر موجود ہیں اور کچھ اور احکام بھی ہیں، چنانچہ وہ روایت بھی امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت کے ساتھ لکھ دی ہے اور وہ اس طرح ہے:

"عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال: لا تلقوا الركبان، ولا يبيع بعضكم على بيع بعض، ولا تناجشوا، ولا يبيع حاضر لباد، ولا تصروا الغنم، ومن ابتاعها فهو بخير النظرين بعد أن يحلبها إن رضيها أمسكها، وأن سخطها ردها وصاعاً من تمر۔"[1]

یعنی "حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم آگے جا کر نہ ملو مال لانے والے قافلوں کو اور کوئی شخص دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے، اور قیمت بڑھانے کے لیے (نمائشی) خریدار نہ بنو، اور کوئی شہری باہر والے کے لیے نہ بیچے اور بکری وغیرہ کے تھنوں میں دودھ نہ روک رکھو، اور جو شخص ایسا جانور خریدے تو وہ دودھ کر دیکھ لینے کے بعد دو امروں میں سے ایک کا مختار ہے، اگر اسے پسند ہو تو رکھ لیوے اور اگر ناپسند ہو تو واپس کر دے اور (واپسی کی صورت میں) اس دودھ کے عوض اصل مالک کو ایک صاع کھجوریں بھی دیوے۔"

---

[1] بخاری مع الفتح دهلوی: 373/8

اس روایت سے امام ہمام والا مقام نجم المحدثین سراج المجتہدین نے سمجھا دیا کہ ابن مسعود کی روایت میں تصریح بالرفع نہیں ہے، لیکن وہ اصل میں مرفوع ہی ہے، کیونکہ دونوں صحابیوں کی روایت میں دونوں امر مذکور ہیں۔

اللہ اکبر! امام بخاری رحمہ اللہ بھی دور رس اور کیسے دقیقہ شناس اور فن حدیث کے کیسے نکتہ دان ہیں۔ اللهم أجزه عن أمة نبيك جزاءً حسنا وافراً

حاصل کلام یہ کہ یہ مسئلہ محض حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے منقول نہیں کہ اسے مخالف قیاس سمجھ کر رد کر دیا جائے، بلکہ ایک مجتہد صحابی سے بھی منقول ہے، جس کا اعتبار حنفی مذہب میں خصوصیت سے ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی تحقیق

اب اس پانچویں نمبر میں ایک بحث کا کچھ حصہ باقی رہ گیا، یعنی اس بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی تحقیق۔ سو معلوم ہو کہ اول تو ہم اصولاً یہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنفیہ اس بات کے قائل ہی نہیں تھے کہ صحابی غیر فقیہ کی روایت جو قیاس کے خلاف ہو قابل ترک ہوتی ہے، اس کا کچھ بیان تو سابقہ نمبر دوم میں ہو چکا اور باقی اب کیا جاتا ہے اس کو ہم دو طرح پر بیان کرتے ہیں:

اول اس طرح کے دیگر جزئیات کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ حدیث کے ہوتے قیاس کو ترک کر دیتے تھے، خاص کر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہی سے کئی مسائل میں قیاس کے خلاف اور حدیث کے موافق عمل کیا، چنانچہ خاتمۃ الحفاظ اسی مسئلہ کی تحقیقات کے ضمن میں فرماتے ہیں:

”واعتذر الحنفية عن الأخذ بحديث المصراة بأعذار شتى فمنهم من طعن في الحديث لكونه من رواية أبي هريرة ولم يكن كابن مسعود وغيره من فقهاء الصحابة فلا يؤخذ بما رواه مخالفا للقياس الجلي، وهو كلام آذىٰ قائله به نفسه، وفي حكايته غنى عن تكلف الرد عليه،وقد ترك أبو حنيفة القياس الجلي لرواية أبي هريرة وأمثاله كما في الوضوء بنبيذ التمر، ومن القهقهة في الصلوة وغير ذلك۔“[1]

[1] فتح الباری، طبع دھلوی: 8/ 371

''اور حنفیوں نے اس حدیث مصراۃ کے ماننے میں چند ایک عذر کیے ہیں کسی نے تو حدیث میں یہ طعن کر دیا کہ وہ ابو ہریرہ کی روایت سے ہے اور وہ ابن مسعود وغیرہ فقہائے صحابہ کی طرح نہ تھے۔پس جو کچھ انہوں (ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) نے قیاس جلی کے خلاف روایت کیا، اسے نہیں لیا جائے گا۔اور یہ ایسا کلام ہے کہ اس کے قائل نے اس سے اپنے آپ کو دکھ میں ڈالا اور صرف اس کا ذکر کر دینا ہی اس کے رد کی تکلیف سے غنی کر دیتا ہے اور بے شک امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے قیاس جلی کو حضرت ابو ہریرہ اور ان جیسے دیگر صحابہ کی روایت کے مقابلہ میں ترک کر دیا ہے، جیسے کہ نبیذ تمر سے وضو کرنے اور نماز میں قہقہہ مار کر ہنسنے سے وضو کے ٹوٹ جانے اور دیگر مسائل میں۔''

اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وأصلوا لا يجب العمل بحديث غير الفقيه إذا انسدباب الرأي،وخرجوا من صنيعهم في ترك حديث المصراة ثم ورد عليهم حديث القهقهة وحديث عدم فساد الصوم بالأكل ناسيا فتكلفوا في الجواب وأمثال ماذكرنا كثيرة لا تخفى على المتتبع، ومن لم يتتبع لا تكفيه الإطالة فضلا عن الإشارة،ويكفيك دليلا على هذا قول المحققين في مسئلة لا يجب العمل بحديث من اشتهر بالضبط والاجتهاد دون الفقه إذا انسد باب الرأي كحديث المصراة أن هذامذهب عيسىٰ بن أبان واختاره كثير من المتأخرين،وذهب الكرخي وتبعه كثيرمن العلماء إلى عدم اشتراط فقه الراوي لتقدم الخبر على القياس، قالوا: لم ينقل هذا القول عن أصحابنا، بل المنقول عنهم أن خبر الواحد مقدم على القياس،ألا ترى أنهم عملوا بخبر أبي هريرة في الصائم إذا أكل أو شرب ناسيا،وإن كان مخالفا للقياس،حتى قال أبو حنيفة رحمه الله : لو لا الرواية لقلت بالقياس۔"[1]

''اور فقہائے حنفیہ نے ایک یہ قاعدہ بنایا کہ غیر فقیہ کی حدیث پر عمل کرنا واجب نہیں ہوگا،

---

[1] حجة الله البالغة،طبع مصرى:160/1

جبکہ اس سے قیاس کا دروازہ بند ہوتا ہو، اور انہوں نے ''حدیث مصراۃ'' کو ترک کر کے ایسا کر کے بھی دکھا دیا، پھر ان کے اس قاعدہ پر حدیث قہقہہ اور بھولے سے کھا لینے والے کا روزہ نہ ٹوٹنے کی حدیث سے جو الزام وارد ہوا تو انہوں نے اس کے جواب میں تکلف سے کام لیا اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کی مثالیں بہت ہیں، ڈھونڈ بھال کرنے والے پر مخفی نہیں اور جو پڑتال اور تلاش نہ کرے، اسے اشارہ کیا، طویل بیان بھی کافی نہیں اور تیرے لیے محض محققین کا یہ قول کافی ہے جو انہوں نے کہا کہ یہ مسئلہ کہ جو (صحابی) قوت حافظہ اور تقویٰ اور دینداری میں مشہور ہو لیکن فقہ واجتہاد میں معروف نہ ہو تو اس کی حدیث پر جبکہ اس سے قیاس کا دروازہ بند ہوتا ہو عمل کرنا واجب نہیں، مثلاً ''حدیث مصراۃ۔'' یہ مذہب عیسیٰ بن ابان کا ہے اور بہت سے متأخرین نے (اس کی پیری میں) اس امر کو اختیار کیا ہے اور امام کرخی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ راوی کا مجتہد ہونا شرط نہیں ہے کیونکہ حدیث (صحیح) قیاس پر (بہرحال) مقدم ہے اور بہت سے علماء نے امام کرخی کی پیروی کی ہے۔ ان کا قول یہ ہے کہ یہ قاعدہ ہمارے مشائخ (حنفیہ) سے منقول نہیں ہے بلکہ ان سے تو یہ منقول ہے کہ (صحیح) خبر واحد (بہرحال) قیاس پر مقدم ہے کیا تو نہیں دیکھتا کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ ہی کی اس حدیث پر (برابر) عمل کیا کہ روزہ دار جب بھول کر کچھ کھالے یا پی لے (تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا) اگرچہ یہ قیاس کے خلاف ہے حتیٰ کہ امام ابوحنیفہ نے کہہ دیا کہ اگر (اس بارے میں) یہ روایت نہ ہوتی تو میں قیاس سے فتویٰ دیتا۔''

دوسرا طریق امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی تحقیق کا یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کے کلام میں اوپر گزر چکا ہے کہ جماعت صحابہ میں اس امر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مخالف کوئی نہیں تھا۔ اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ جس امر میں قرآن وحدیث سے دلیل نہ ملے اور جماعت صحابہ میں بھی اختلاف نہ ہو اس میں آپ صحابہ کے اقوال سے باہر نہیں جاتے۔ پس جس امر میں حدیث مرفوع بھی موجود ہو اور اس میں ایک ایسے مجتہد صحابی کا فتویٰ بھی ہو، جس کی عظمت

ان کے دل میں بغایت ہے اور اس امر میں جماعت صحابہ میں بھی اختلاف نہ ہو تو اس کی خلاف ورزی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب نہیں ہوسکتا۔

چھٹا امر

یعنی خبر واحد کے لیے موافقت کتاب وسنت مشہورہ کا شرط ہونا۔ سو اس کا بیان اس طرح ہے کہ یہ قاعدہ تو سنہرا ہے، لیکن حقیقت میں سنت صحیحہ کو ٹال دینے کا خفیہ اور مہذب حیلہ ہے، کیونکہ یہ قاعدہ اس حدیث پر چسپاں نہیں ہوتا۔ قرآن مجید کی کوئی آیت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی صحیح و مشہور حدیث یا کم از کم صحیح خبر واحد ایسی نہیں جس میں اس ''حدیث مصراۃ'' کے خلاف حکم مذکور ہو اور اسے اس کا مخالف کہہ کر رد کر دیا جائے۔ علمائے حنفیہ نے اس امر میں جو کچھ لکھا ہے وہ کتاب وسنت کے بعض احکام سے نتائج اخذ کر کے ایک حکم کو اپنے ذہن میں جما لیا ہے پھر اس حدیث کے حکم کو اس اپنے سمجھے ہوئے ذہنی حکم کے خلاف قرار دے کر حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ٹال دیا ہے اور اس روش سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے، چنانچہ وارد ہے:

''سمع النبي صلى الله عليه وسلم قوما يتدارؤن في القرآن فقال: إنما هلك من كان قبلكم بهذا، ضربوا كتاب الله بعضه ببعض، وإنما نزل كتاب الله يصدق بعضه بعضا، فلا تكذبوا بعضه ببعض، فما علمتم منه فقولوا: وما جهلتم فكلوه إلى عالمه۔''[1]

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ لوگوں کو قرآن میں جھگڑا کرتے سنا تو آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اسی روش کی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کی بعض آیات کو بعض سے ٹکرایا۔ اور کتاب اللہ کی آیات تو ایک دوسری کی تصدیق کرتی ہوئی نازل ہوئیں، پس تم بعض کو بعض سے نہ جھٹلاؤ، جو بات تم کو کتاب اللہ سے معلوم ہو جائے وہ کہہ دو اور جو معلوم نہ ہو اسے اس کے جاننے والے کے سپرد کر دو (یعنی خود اس میں لب کشائی نہ کرو)''

پس جائز نہیں کہ نصوص کتاب وسنت کو آپس میں ٹکرا کر بعض کو بعض سے ردّ کر دیں۔ اس کے

[1] رواه احمد حديث: 6741

بعد یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ شرط مذکورہ بالا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی آیت یا سنت مشہورہ سے جو کسی نے اجتہاد سے مستنبط کیا ہے اس کی موافقت ضروری ہے، بلکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ جو حکم اس خبر واحد میں مذکور ہے کسی آیت قرآنی یا سنت مشہورہ مقبولہ میں اس کے خلاف مذکور نہ ہو، مثلاً ''حدیث تصریہ'' میں دو حکم ہیں۔

ایک تصریہ پر مشتری کو واپسی کا اختیار، دوم واپسی کی صورت میں ایک صاع کھجور کا ساتھ ادا کرنا، پس اس کی مخالفت میں کوئی ایسی آیت یا حدیث مشہور (یا کم از کم صحیح خبر واحد ہی سہی) پیش کردی جائے، جس میں ان دونوں حکموں کے خلاف حکم ہو، یعنی اس میں تصریہ واپسی کا حق زائل کیا گیا ہو اور دودھ مفت میں ہضم کر جانا فرمایا گیا ہو اور ہم نہایت یقین سے کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں کوئی ایسی نص نہ ملے گی اور نہ آج تک علمائے حنفیہ کو ملی ہے ورنہ وہ اپنی اجتہادی قوت کو صرف کرنے پر مجبور نہ ہوتے۔

علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ نے شرح صحیح بخاری میں جس قدر امور ذکر کیے ہیں، وہ سب استنباطی ہیں جن کی موافقت اللہ کے رسول اور اس کی شرع کے امین ومبین صلوات اللہ علیہ وسلامہ پر لازم گردانی عکس موضوع ہے اور یہی توضیح ہے فتح الباری کی اس عبارت کی جو سابقاً گزر چکی ہے۔ یعنی ''فکیف یرد الأصل بالفرع'' یعنی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، جو اصل ہے، قیاس سے، جو فرع ہے، کس طرح رد کر سکتے ہیں؟

باوجود اس کے پھر بھی علمائے حدیث ان میں سے ایک ایک کا جواب دے کر سبکدوش ہو چکے ہیں اور حافظ ابن عبدالبر کے کلام سے انہی کی نسبت ''لاحقیة لها'' یعنی وہ بالکل بے حقیقت ہیں کا حکم گزر چکا ہے، اور فتح الباری اور نیل الاوطار اور اعلام الموقعین میں بالتفصیل مذکور ہیں۔

ساتواں امر

یعنی روایت ''تکثر لکم الأحادیث عنی۔۔۔الخ'' کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت بالکل جھوٹی اور موضوع ہے اور صاحب اصول شاشی کی فن حدیث سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اور اصول شاشی کے بعض محشی تو ایسے بھی ہوئے جنہوں نے اس کا پتا صحیح بخاری میں بتایا ہے حالانکہ یہ روایت صحیح

بخاری میں نہ ہے اور نہ ہوسکتی ہے کیونکہ یہ حقیقت میں موضوع ہے اور اس بات کو خود حنفیہ نے تسلیم کیا ہے، چنانچہ علامہ تفتازانی تلویح میں اسی مسئلہ یعنی خبر واحد کے سلسلہ میں حدیث مصراۃ کے ذکر کے بعد اس روایت کی نسبت فرماتے ہیں:

"واستدل على ذلک بقوله عليه السلام: يكثر لكم الأحاديث من بعدى، فإذا روي لكم عني حديث فاعر ضوه على كتاب الله فما وافق فاقبلوه وما خالفه فردوه، وأجيب بأنه خبر واحد، وقد خص منه البعض، أعنى المتواتر والمشهور فلا يكون قطعياً فكيف يثبت به مسئلة الأصول على أنه ما يخالف عموم قوله تعالى﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾وقد طعن فيه المحدثون بأن في رواته يزيد بن ربيعة وهو مجهول، وترک في أسناده واسطة بين الأشعث وثوبان فيكون منقطعا وذكر يحيىٰ بن معين رحمه الله أنه حديث وضعته الزنادقة وإيراده البخارى إياه في صحيح لا ينافى الانقطاع۔"[1]

اس بات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول سے استدلال کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "میرے بعد تمہارے پاس میری بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی، پس جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی حدیث روایت کی جائے تو اسے "کتاب اللہ" پر پیش کرنا، پس جو اس کے موافق ہو اسے قبول کر لینا اور جو اس کے خلاف ہو، اسے رد کر دینا۔" اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ خبر واحد ہے اور اس سے بعض اقسام یعنی حدیث متواتر اور حدیث مشہور مخصوص ہیں۔ پس یہ (حدیث) قطعی نہیں ہوسکتی پس اس سے اصول کا (یہ) مسئلہ کس طرح ثابت ہوسکتا ہے، علاوہ اس کے یہ بھی ہے کہ یہ (حدیث)﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ یعنی جو کچھ تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیویں لے لو، کے عموم کے خلاف ہے اور محدثین نے اس میں طعن بھی کیا ہے، کیونکہ اس کے راویوں میں سے یزید بن ربیعہ ہے اور وہ مجہول ہے اور اس کی اسناد میں اشعث اور ثوبان کے درمیان ایک واسطہ متروک ہے پس یہ (روایت) منقطع ہے اور امام یحییٰ بن معین نے کہا کہ یہ حدیث زندیقوں (بے دین لوگوں) نے

[1] تلویح: 9/2 مبطوعہ مصر

جعلی بنائی ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ [1] کا اس کو اپنی صحیح میں روایت کرنا اس کے منقطع ہونے کے منافی نہیں۔''

آٹھواں امر

حدیث مصراۃ حکم معقول وحکیمانہ اور عدل وانصاف کا پیمانہ ہے۔ پہلے قیاس شرعی کی حقیقت سمجھ لینی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے کوئی ایسا امر آجاوے جس کے حکم کے لیے کوئی خاص نص شرعی قرآن یا حدیث سے ہمیں معلوم نہیں۔ پس ہم کتاب وسنت میں نظر کر کے کوئی ایسی نص معلوم کریں جس سے اس پیش افتادہ امر کو تعلق ہو۔ اور ان دونوں میں ایک علت جامعہ پائی جائے۔ پس اس علت جامعہ کی وجہ سے ہم اس پیش افتادہ امر پر وہی حکم لگادیں جو اس منصوص امر میں شارع علیہ السلام کی طرف سے لگا ہوا ہے پس یہ ہے حقیقت قیاس شرعی کی، چنانچہ توضیح میں ہے:

''هو تعدية الحكم من الأصل إلى الفرع بعلة متحدة،لاتدرك بمجرد اللغة''[2]

''قیاس یہ ہے کہ اصل (یعنی نص قرآن وحدیث) کا حکم فرع (امر پیش افتادہ) پر علت جامعہ کی وجہ سے لگایا جائے جس کا ادراک مجرد لغت سے نہ ہو۔''

اور علامہ تفتازانی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

''وفي الشرع مساواة الفرع للأصل في علة حكمه۔''

''اور شریعت میں قیاس نام ہے فرع کا اصل کے مساوی ہونے کا علتِ حکم میں۔''

اور شیخ ابن ہمام حنفی ''تحریر'' میں فرماتے ہیں:

''وفي الاصطلاح :مساواة محل لآخر في علة حكم له شرعي، لاتدرک من نصه

---

[1] علامہ تفتازانی کا اس روایت کو امام بخاری کی تخریج قرار دینا بالکل غلط ہے بھلا یہ منکر موضوع روایت صحیح بخاری میں کیسے ہوسکتی ہے؟ علامہ نے بعض محشیوں کی پیروی سے بغیر تحقیق کے ایسا لکھ دیا ہے اور ایسی باتیں کتب فقہ میں بہت ہیں کہ ان کی نقل در نقل غلط ہی ہوتی گئی۔ مثلاً صاحب الانوار نے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں ہے ﴿ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا﴾ حالانکہ قرآن میں اس طرح ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا﴾ اور فقہاء اسے غلط ہی نقل کیے جاتے ہیں

[2] 52/2

بمجرد اللغة۔"①

"یعنی اصطلاح میں قیاس یہ ہے کہ ایک محل دوسرے کے مساوی ہو اس کے حکم شرعی کی علت میں جو مجرد لغت سے معلوم نہ ہوسکتا ہو۔"

اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ "حجۃ اللہ" میں فرماتے ہیں:

"تمثیل صورة بصورة في علة جامعة بينهما۔"②

"یعنی قیاس تمثیل ہے ایک صورت کی دوسری صورت سے اس علت جامعہ میں جو دونوں کے درمیان ہو۔"

ان سب عبارتوں کا حاصل مطلب قریباً ایک ہی ہے اور امر مشترک زیر تحقیق میں سب متفق ہیں۔

ان سب عبارتوں سے واضح ہوگیا کہ قیاس و اجتہاد کی ضرورت اس امر میں پڑتی ہے جس میں نص شرعی معلوم نہ ہو یا موجود نہ ہو، اور یہ بھی کہ قیاس کی بنا نصوص قرآن وحدیث پر ہے، جس سے غیر منصوص کا حکم اخذ کیا جاتا ہے اور اس ضرورت کو رفع کیا جاتا ہے، اس لیے اہل اصول بالاتفاق کہتے ہیں کہ قیاس مظہر حکم ہوتا ہے نہ کہ مثبت حکم۔③

یعنی قیاس سے اس حکم کو ظاہر کیا جاتا ہے، جو نصوص شرعیہ میں ملحوظ شارع ہے نہ کہ نئے سرے سے کسی حکم کی ایجاد، چنانچہ صاحب توضیح فرماتے ہیں:

"وهذا ماقالوا: إن القياس مظهر للحكم لا مثبت۔"④

پس قیاس شرعی یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی خاص نص شرعی کو اجتہاد و استنباط سے رد کر دیا جائے۔

خلاصۃ المرام یہ کہ قیاس شرعی یہ ہے کہ منصوصات قرآن وحدیث کو اصل بنا کر غیر منصوص کا حکم معلوم کیا جائے یہ نہیں کہ نصوصِ قرآن وحدیث کو جو اصول شرع ہیں، اپنے استنباط سے رد کر دیا

---

① 117/3

② 1/135، مطبوعہ مصر

③ توضيح ونورالأنوار

④ 2/35 مطبوعہ مصر

جائے وهل هذا إلا عكس الموضوع ۔یعنی اس سے تو اصل حقیقت ہی پلٹ جائے گی اور اصل (قرآن وحدیث) فرع ہوجائے گا اور فرع (قیاس) اصل ہوجائے گی، جیسا کہ فتح الباری سے سابقاً حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کے قول سے گزر چکا ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ حدیث مصراۃ اصالتہً نصوص شرعیہ میں سے ہے اور اپنے ثبوت کے لیے کسی قیاس کی محتاج وممنون احسان نہیں، لیکن چونکہ ہر حکم شرعی اپنے اندر ایک مصلحت وحکمت رکھتا ہے جس میں بندگان خدا کی دنیوی واخروی یا اخلاقی بہتری ہوتی ہے اس لیے ہم اس حکمت کے متعلق بھی کچھ لکھتے ہیں تاکہ ہمارے ناظرین کو اس کی معقولیت اچھی طرح ذہن نشین ہوجائے۔

تصریہ کی ممانعت میں علت وحکمت

سو معلوم ہو کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانور کو اس کے تھنوں میں دودھ روک کر بیچنے سے منع کرتے ہیں اور اگر کوئی اس طرح کر کے جانور بیچ دیوے تو آپ اس خریدار کے لیے واپس کر دینے کا حق ثابت کرتے ہیں، تو اس میں آپ دھوکہ اور فریب دینے سے روکتے ہیں اس سے دھوکہ دینے والے کو تو باطنی خباثت اور اخلاقی برائی سے پاک رکھنا منظور ہے اور جس کو دھوکے سے ایسا جانور دیا جائے، اس کے مال کو نقصان سے اور اس کے دل کو صدمہ سے بچانا منظور ہے، کیونکہ جب کسی جانور کا دودھ ایک وقت یا دو وقت اس کے تھنوں میں بند رکھا گیا اور معرض بیع میں پیش کیا گیا تو جانور کو ناحق تکلیف پہنچنے کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ خریدار تو یہی سمجھے گا کہ عادتاً اور معمولاً اس جانور کا دودھ اتنا ہی ہوا کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اتنا نہیں ہوتا، تو یہ سراسر فریب ہے، کیونکہ جو حقیقت واظہار کے خلاف ہے وہ جھوٹ اور فریب ہوتا ہے، پس حکیم حقانی رسول ربانی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص ایسا جانور خریدے اور بعد میں اسے معلوم ہو کہ مجھے دھوکا دیا گیا تو وہ مختار ہے۔ اگر وہ باوجود اس کیفیت کے اس جانور کو رکھ لینا چاہتا ہے تو رکھ لیوے اور اگر واپس کر دینا چاہتا ہے تو اسے واپسی کا اختیار ہے اصل مالک کو واپس پھیر دے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس دودھ کے عوض جو اس نے حاصل کیا، ایک صاع تمر بھی ساتھ دیوے اور اس میں واپسی کے وقت اصل مالک

کی تالیف بھی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ اسی حدیث مصراۃ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"أقول: التصرية جمع اللبن في الضرع ليتخيل المشتري غزارته فيغتر، ولما كان أقرب شبهه بخيار المجلس أو الشرط لأن عقد البيع كان مشروطا بغزارة اللبن،لم يجعل من باب الضمان بالخراج، ثم لما كان قدر اللبن وقيمته بعد إهلاكه وإتلافه متعذر المعرفة جدا، لا سيما عند تشاكس الشركاء،وفي مثل البدو، وجب أن يضرب له حد متعدل بحسب المظنة الغالبية يقطع به النزاع، ولبن النوق فيه زهومة ويوجد رخيصا، ولبن الغنم طيب،ويوجد غاليا، فجعل حكمهما واحدا فتعين أن يكون صاعا من أدنىٰ جنس يقتاتون به كالتمر في الحجاز، والشعير والذرة عندنا، لا من الحنطة والأرز فإنها أعلى الأقوات وأغلاها، واعتذر بعض من لم يوفق للعمل بهذا الحديث بضرب قاعدة من عند نفسه فقال كل حديث لا يرويه إلا غير الفقيه إذا انسد باب الرأي فيه يترك العمل به، وهذه القاعدة لا تنطبق على صورتنا هذه، لأنه أخرجه البخاري عن ابن مسعود أيضاً، وناهيك به، ولأنه بمنزلة سائر المقادير الشرعية يدرك العقل حسن تقدير مافيه، ولا يستقل بمعرفة حكم هذا القدر خاصة، اللهم إلا عقول الراسخين في العلم۔"

"(میں کہتا ہوں) تصریہ تھنوں میں دودھ کے جمع کرنے کو کہتے ہیں، تاکہ خریدار دودھ کی زیادتی کا خیال کر کے دھوکے میں پڑ جائے، چونکہ اس کی شباہت خیارِ مجلس یا شرط کے بہت قریب تھی، کیونکہ سودے کا منعقد ہونا گویا کہ اسی بات پر ہے کہ وہ دودھ کی زیادتی سے مشروط ہے، اس لیے "خراج بالضمان" کے باب سے نہیں بنایا گیا، پھر چونکہ دودھ کی مقدار اور اس کی قیمت اس کے تلف ہو جانے کے بعد بہت مشکل تھی کہ پہچانی جائے، خصوصاً شرکاء کے جھگڑے کے وقت اور صحرا جیسے مقام میں تو واجب ہوا کہ اس کے لیے بموجب ظن غالب کے کوئی معتدل حد مقرر کی جائے جس سے نزاع قطع ہو جائے اور

(چونکہ) اونٹی کے دودھ میں بو ہوتی ہے اور ارزاں مل سکتا ہے، اور بکری کا دودھ عمدہ ہوتا ہے اور گراں ملتا ہے، اس لیے ان دونوں کا حکم ایک ہی رکھا گیا، پس متعین ہوا کہ وہ ایک صاع ہو، اس ادنیٰ جنس (غلہ) میں سے جو عام لوگوں کی خوراک ہو مثل کھجور کے حجاز میں اور جو اور جوار کے ہمارے ملک میں، نہ گیہوں اور نہ چاول کی جنس سے کیونکہ یہ دونوں سب خوراکوں میں سے گراں اور اعلیٰ ہیں، اور جس شخص کو اس حدیث پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ملی، اس نے اپنے نفس سے ایک قاعدہ گھڑ کر یہ عذر بنایا اور کہا کہ ہر وہ حدیث جس کا راوی (صحابی) غیر فقیہ ہو، جب اس میں رائے (قیاس) کا دروازہ بند ہو جاتا ہو تو اس حدیث پر عمل ترک کر دیا جائے گا اور یہ قاعدہ جیسا کچھ بھی (واہی) ہے ہماری اس (پیش نظر) صورت پر منطبق بھی نہیں ہوتا، کیونکہ اس مسئلہ (مصراۃ) کو امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی روایت کیا ہے اور تمہارے لیے مجتہد ہونے میں کافی ہیں اور اس لیے بھی کہ اس (ایک صاع) کا تقرر شریعت کی مقرر کردہ مقداروں کی طرح ہے جس کے حسن و خوبی کو تو عقل پا سکتی ہے، لیکن خاص اس مقدار کی معرفت کو بالاستقلال حاصل نہیں کر سکتی، مگر راسخین فی العلم کی عقل (جن کو منجانب اللہ بصیرت ہوتی ہے)۔''

اسی طرح امام ابن تیمیہ الحرانی شیخ الاسلام رحمہ اللہ ''رسالة في معنى القياس'' میں لکھتے ہیں:

''وحقيقة الأمر أنه لم يشرع شيء على خلاف القياس الصحيح بل ما قيل إنه على خلاف القياس فلا بد من اتصافة بوصف امتيازية عن الأمور التي خالفها، واقتضى مفارقته لها في الحكم۔۔۔۔الخ''[1]

''اور حقیقت امر یہ ہے کہ شریعت میں قیاس صحیح کے خلاف کوئی چیز مقرر نہیں کی گئی، بلکہ جس امر کو خلافِ قیاس کہا گیا ہے، اس میں لازماً ایسا وصف ہے، جس سے وہ ان امور سے ممتاز و الگ رکھا گیا، جس کے وہ خلاف ہے اور اس سے مفارقت و جدائی کا متقاضی ہے۔''

اس کے بعد شیخ الاسلام نے حدیث مصراۃ کا ذکر کر کے ان اعتراضوں کے جوابات ذکر کیے

[1] مجموع رسائل شيخ الاسلام: 256/2

ہیں جو علمائے حنفیہ کی طرف سے اس حدیث کے متعلق کیے گئے ہیں۔

شیخ الاسلام کی تحریر کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جن نصوص سے استنباط کر کے حنفیہ نے اس حدیث کو رد کیا ہے یہ حدیث ان نصوص کی ہم قسم جزئی نہیں ہے، بلکہ یہ مستقل ایک خاص صورت ہے جس کا حکم ان سے الگ ہونا چاہیے، پھر وجوہات مفارقت ذکر کئے ہیں جن کا بیان موجب طوالت ہے۔

اسی طرح حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی ''اعلام الموقعین'' میں اس حدیث پر مفصل لکھا ہے اور سب عذروں کو ایک ایک کر کے اڑا دیا ہے اور کہا ہے:

''كل ما ذكر تموه خطأ، والحديث موافق لأصول الشريعة وقواعدها، ولو خالفها لكان أصلاً بنفسه، كما أن غيره أصل بنفسه، وأصول الشرع لا يضرب بعضها ببعض، كما نهى رسول الله ﷺ أن يضرب كتاب الله بعضه ببعض، بل يجب اتباعها كلها، ويقر كل منها على أصله وموضعه، فإنها كلهامن عندالله الذي أتقن شرعه وخلقه، وماعدا هذا فهوالخطأالصريح۔''[1]

''جو کچھ تم (حدیث مصراۃ کو رد کرنے والوں) نے ذکر کیا ہے وہ بالکل خطا ہے اور یہ حدیث اصول شریعت اور اس کے قواعد کے (سراسر) موافق ہے اور اگر (بالفرض) خلاف بھی ہو تو وہ بذاتِ خود ایک اصل ہے، جس طرح کہ دوسری احادیث اصل ہیں اور اصول شریعت کو ایک دوسرے سے ٹکرایا نہیں جاتا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا کہ کتاب اللہ کے بعض کو بعض سے ٹکرایا جائے، بلکہ سب (نصوص شرع) کی پیروی واجب ہے اور ہر ایک کو اس کے مقام و موضوع پر مقرر کیا جائے کیونکہ وہ سب کے سب اللہ کی طرف سے ہیں جس نے اپنی شریعت کو بھی اور اپنی مخلوق کو بھی خوب پختہ بنایا (کہ ان میں کوئی کسر نہیں رکھی ہے) اور اس کے سوا جو کچھ بھی ہے سو وہ صریح خطا ہے۔''

اب ہم بعض ایسے مسائل بیان کرتے ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکیم حقانی رسول

---

[1] اعلام الموقعين،طبع مصرى:126/2:

ربانی نے خریدار کے لیے سودا واپس کر دینے کا اختیار باقی رکھا ہے اور ان میں عامۃ الناس کی مالی اور اخلاقی بہبودی ملحوظ رکھی ہے۔

پہلی مثال

صحیح مسلم وغیرہ میں ہے:

" عن أبي هريرة قال: نهى رسول الله ﷺ أن يتلقى الجلَبُ فمن تلقى فاشتراه فإذا أتى سيده السوق فهوبالخيار۔" أخرجه الخمسة،وهذا لفظ مسلم والترمذي وأبو داؤد۔[1]

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کیا کہ آگے جا کر بنجاروں سے ملا جائے، پس اگر کوئی اس کا مالک بازار میں آوے تو وہ مختار ہے (چاہے بیع کو قائم رکھے چاہے توڑ دے)۔"

دوسری مثال

"عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ مرفي السوق على صبرة طعام فأدخل يده فيها فنالت أصابعة بللا، فقال: ما هذا يا صاحب الطعام؟ فقال: يا رسول الله أصابته السماء، قال: أفلا جعلته فوق الطعام حتیٰ يراه الناس؟ من غشنا فليس منا۔"[2]

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بازار میں غلہ کے ایک ڈھیر پر گزرے تو (وحیِ[3] ربانی سے) اس ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈالا تو آپ کی انگلیوں کو کچھ تری محسوس ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے صاحب غلہ! یہ کیا؟ اس نے عرض کیا: یارسول اللہ!

---

[1] تیسیر الوصول،کتاب البیوع، جلد اول

[2] صحیح مسلم ،کتاب الایمان باب من غشنا فلیس منا،حدیث:102

[3] وحی کا ذکر ترمذی اور ابوداؤد کی روایت میں ہے۔(میر سیالکوٹی رحمہ اللہ)

اس پر بارش پڑ گئی تھی۔ آپ نے فرمایا: تو پھر تو نے اسے اوپر کیوں نہ کر دیا کہ لوگ اس کو دیکھ لیتے (اور یہ بھی فرمایا) جو ہمیں دھوکا[1] دے گا وہ ہم میں سے نہیں ہوگا۔''

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ اپنے متاع کی کوئی ایسی بات چھپائی کہ اگر وہ ظاہر کی جائے گی تو خریدار نہ خریدے گا، شریعت مطہرہ میں منع ہے اور دیانت کے خلاف ہے۔

اسلامیوں کا وطیرہ یہ ہونا چاہیے کہ جو کچھ بھی حقیقت ہے، وہ ظاہر کر دیں، اس پر جو چاہے خریدے جو نہ چاہے نہ خریدے، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عداء بن خالد (صحابی) کے پاس (غلام) بیچا تو آپ نے حضرت عداء کو یہ دستاویز لکھ دی:

''هذا ما اشترى محمد رسول الله ﷺ من العداء بن خالد بيع المسلم من المسلم لا داء ولا خبثة ولا غائلة'' وقال قتادة: الغائلة الزفا والسرقة والأباق۔''[2]

''یہ وہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے عداء بن خالد کے ہاتھ بیچا ایسی بیع سے جو ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے کیا کرتا ہے۔[3] اس میں نہ تو کوئی بیماری ہے اور نہ کوئی بری عادت ہے اور نہ مکر وفریب یا چوری یا بے اجازت بھاگ جانے کا عیب۔''

اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ اسلامی طریق اور رسول اللہ ﷺ کی سنت یہ ہے کہ بائع اپنے مال کی حقیقت واقعی ظاہر کر دیوے۔

اسی طرح ترمذی وغیرہ میں ہے:

''عن عائشة رضي الله عنها أن رجلا ابتاع غلاما فأقام عنده ماشاءالله تعالىٰ ثم وجد به عيبا فخاصمه إلى رسول الله ﷺ فرده عليه فقال الرجل: يا رسول الله قد استغل غلامي فقال رسول الله ﷺ الخراج بالضمان۔'' أخرجه أصحاب السنن۔[4]

---

[1] صحیح مسلم کی دوسری روایت میں مطلقاً (مَنْ غَشّ) بغیر ذکر مفعول کے ہے، یعنی جس کسی کو بھی دھوکہ دے گا گنہگار ہوگا، عام اس سے کہ دوسرا شخص مسلمان ہو یا کون ہو۔ (میر سیالکوٹی رحمہ اللہ)

[2] صحیح بخاری، کتاب البیوع في ترجمة باب إذا بين البيعان ولم يكتما الخ

[3] سبحان اللہ! کیا پیارے الفاظ ہیں گویا سمجھا دیا کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کا معاملہ ایسا ہو کہ اس میں کسی قسم کا دھوکہ نہ ہو۔

[4] تیسر الوصول: 57/1، مطبوعه نولکشور کانپور

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ایک غلام خریدا، پس وہ غلام کچھ مدت اس کے پاس رہا پھر اس نے اس میں کوئی عیب پایا تو بائع اور مشتری دونوں وہ جھگڑا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب میں لائے تو آپ نے وہ غلام بائع کو واپس کر دیا اس نے کہا: یارسول اللہ! یہ مشتری میرے غلام سے نفع اٹھاتا رہا ہے آپ نے فرمایا:'' الخراج بالضمان۔''[1] یعنی محاصل ضمان کی وجہ سے اسی کا حق ہے۔''

یہ صورت جو اوپر مذکور ہوئی اسے خیار عیب کہتے ہیں اور حنفیوں کے ہاں بھی مسلم ہے چنانچہ ہدایہ میں ہے:

''وإذا اطلع المشتري على عيب في المبيع فهو بالخيار إن شاء أخذه بجميع الثمن وإن شاء رده لأن مطلق العقد يقتضي وصف السلامة فعند فواته يتخير كيلا يتضرره بلزوم مالا يرضیٰ به۔''[2]

''اور جب خریدار مال بیع میں کسی عیب پر آگاہی پاوے تو وہ مختار ہے اگر چاہے تو اسے پوری قیمت کے عوض رکھ لے اور اگر چاہے تو اسے واپس پھیر دے، کیونکہ سودے کا پورا ہونا بالاطلاق عیب سے سلامت ہونے کو چاہتا ہے پس سلامتی کے نہ ہونے کی صورت میں مشتری مختار ہے تاکہ وہ ایسی شے کے لازم ہوجانے سے ضرر نہ پاوے جس پر وہ راضی نہیں۔''

پھر عیب کی تعریف اس طرح کی ہے:

---

[1] ''الخراج بالضمان'' کی تشریح میں مولانا وحید الزمان مرحوم ''وحید اللغات'' میں فرماتے ہیں: مثلاً ایک غلام خریدا اس کو کام میں لگا کے کچھ منفعت کمائی، اب اس میں ایسا عیب نکلا جو بائع نے مشتری کو نہیں بتلایا تھا، اور مشتری نے اس عیب کی وجہ سے وہ غلام بائع کو پھیر دیا، تو مشتری اپنی قیمت بائع سے واپس لے لے اور غلام کی کمائی جو مشتری کے پاس ہوئی وہ مشتری ہی کی ہوگی، اس لیے کہ وہ اس غلام کا ضامن اور جوابدہ تھا، اگر وہ ہلاک ہوجاتا تو اسی کا نقصان ہوتا۔ شریح رحمہ اللہ جو کوفہ کے قاضی تھے، انہوں نے ایک مقدمہ میں ایسا ہی فیصلہ کیا، کہا عیب دار غلام کو پھیر دے اور جو کچھ اس نے کمائی کی ہے وہ ضمان کی وجہ سے تیری ہی ہے۔ (ص:24 حرف الخاء) ''قلت: كذا في النهاية للإمام ابن الأثير رحمه الله'' اور امام ترمذی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

[2] هدايه، كتاب البيوع، باب خيار العيب

”وکل ما أوجب نقصان الثمن في عادة التجارہ فھو عیب۔“

”ہر وہ امر جس سے تاجروں کے نزدیک مال کی قیمت کم ہو جاتی ہو وہ عیب ہے۔“

اب دیکھنا چاہیے تصریہ کی صورت میں اگر مثلاً کسی گائے کا دودھ آٹھ سیر نکلا اور اس کی قیمت ایک سو روپیہ ہوئی اور خریدنے کے بعد گھر جا کر دوسرے وقت میں چھ سیر دودھ ہوا اور اس نے اسے بیچنا چاہا تو اس جانور کی قیمت سو روپیہ مل جائے گی۔ اگر نہیں مل سکتی تو تصریہ کو عیب کے سلسلہ میں کیوں نہ لیا جائے، کیونکہ اس کی صورت یہ ہے کہ جانور کے تھنوں میں دودھ جمع رہنے دیا جاتا ہے، تاکہ خریدار کو زیادہ معلوم ہو اور حقیقت میں عادتاً اس جانور کا ایک وقت کا دودھ اتنا نہیں ہوتا تو خریدار دھوکہ کھا جاتا ہے، پس شریعت مطہرہ نے (جو لوگوں کے مالوں کی بھی ویسی ہی محافظ ہے، جیسی ان کی جانوں کی اور عزتوں کی ہے) ایسے سودے میں مشتری کو اختیار دیا کہ اگر اسے پسند نہیں ہے تو واپس کر دیوے اور یہ عین عدل ہے۔

ایک اور نکتہ کی بات ہے کہ ”ہدایہ“ میں خیار عیب کی علت یہ بیان کی ہے:

”کیلا یتضرر بلزوم مالا یرضیٰ بہ“

”تاکہ مشتری اس بیع کے لازم ہونے سے ہے نقصان نہ اٹھاوے جس پر وہ راضی نہیں ہے۔“

اور حدیث زیرِ بحث میں بھی یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”وإن سخطھا ردھا“ یعنی ”وہ اس پر راضی نہیں تو واپس کر دیوے۔“ [1]

پس اب تو موافقت کی صورت نکل آئی کہ حنفی بزرگ بھی ناراضی کی صورت میں بیع کو لازم نہیں کرتے اور حدیث میں بھی یہی ہے تو اختلاف کس امر میں رہا؟ اسی امر میں کہ ہم حنفی ہیں اور ہمارے بزرگوں نے اس حدیث پر عمل نہیں کیا۔ اور یہ خصلت درست نہیں، کیونکہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے جب وہ صحت کو پہنچ جائے، سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے، کیونکہ سب مسلمان اس دربار کے غلام ہیں، کسی کو یہ اختیار نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے آگے سر اٹھا سکے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ

[1] صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب النھی للبائع أن لا یحفل الابل، حدیث: 2150

أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا﴾ (الاحزاب:36)

''اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ جائز نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی امر کا فیصلہ کر دیوے تو ان کو اپنے اس امر میں کچھ اختیار باقی رہے اور جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں پڑے گا۔''

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ''ہدایہ'' میں جو کہا ''مطلق العقد'' یعنی یہ سودے کا مقرر ہو جانا تقاضا کرتا ہے کہ مال عیب سے بَری ہے، پس جب وصف سلامت نہ پایا گیا تو مشتری کو واپسی کا اختیار ہونا چاہیے، اس سے بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ تصریہ کی صورت میں واپسی کا اختیار ہونا چاہیے، کیونکہ سودے کے وقت جو حالت جانور کی دکھائی گئی تھی، وہ اس کی واقعی و حقیقی نہ تھی بلکہ بناوٹی تھی اور وہ اس کے بعد پائی نہیں گئی اور عادتاً یہ امر مثل اس معاملہ کے ہے جس میں ناپسندیدگی پر واپسی کی شرط کر لی گئی ہو، پس مشتری کو واپس کرنے کا حق ہونا چاہیے چنانچہ حاشیہ ''ہدایہ'' میں ''وصف السلامۃ'' پر کہا ہے:

''أي سلامة المعقود عليه فكانت سلامته كالمشروط صريحا لكونها مطلوبة عادة فعند فوات وصف السلامة يتخير المشتري إذلولزم العقد للزم بدون رضاه ولا بد من رضاه۔''[1]

''وہ جس کا سودا کیا گیا (سلامت چاہیے) پس اس کی سلامتی مثل اس کے ہے، جس میں صریحاً شرط کر لی گئی ہو، کیونکہ عادتاً سلامتی (بے عیب ہونا) مطلوب ہوتا ہے، پس وصف سلامتی کے نہ ہونے کی صورت میں مشتری کو اختیار ہے کیونکہ اگر وہ بیع لازم قرار دی جائے تو اس کی رضا کے بغیر منعقد ہو گی حالانکہ اس میں اس کی رضا ضروری ہے۔''

اس عبارت پر غور کیجیے کہ فطرت کی شہادت سے یہ بزرگ وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو حدیث کا منشا ہے لیکن جب تصریہ کا بالخصوص نام آ جائے تو مخالفت کریں گے، اس لیے کہ ان کے مذہب میں اسے تسلیم نہیں کیا گیا تو معلوم ہوا کہ انکار کی وجہ صرف مذہبی تقلید ہے ورنہ دلیل

[1] ''ہدایہ''، محشی مولوی عبدالحی مطبوعہ مطبع فاروقی دھلی، ص:24 درحاشیہ:15

اور شہادتِ فطرت اس کے خلاف ہے۔

تیسرا نکتہ یہ کہ ''متن ہدایہ'' میں ''فصل فیما یکرہ'' میں چند ایسی باتیں مکروہ (قریب بحرام) لکھی ہیں، مثلاً کہا ہے:

''ونهى رسول الله ﷺ النجش وعن السوم على سوم أخيه وعن بيع الحاضر للبادي۔'' [1]

''منع کیا رسول اللہ ﷺ نے نجش [2] سے اور اپنے (مسلمان) بھائی کے سودے پر سودا کرنے سے اور شہری آدمی کے بدوی کے لیے بیچنے سے۔''

اور یہ وہی امر ہیں جو حدیث ابو ہریرہ میں مع حکم تصریہ کے بھی مذکور ہیں، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:

''عن أبي أن رسول الله ﷺ قال: لا تلقوا الركبان ولا يبيع بعضكم على بيع بعض ولا تناجشوا ولا يبيع حاضر لباد ولا تصروا الغنم ومن ابتاعها فهو بخير النظرين بعد أن يحلبها إن رضيها أمسكها وإن سخطها ردها وصاعا من تمر۔'' [3]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بنجاروں کو ان کے بازار میں مال اتارنے سے پہلے آگے سے جا کر (راستے میں) نہ ملا کرو، اور کوئی شخص دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرے اور محض قیمت بڑھانے کے لیے (نمائشی) خریدار نہ بنا کرو اور کوئی شہری کسی بدوی کے لیے بیع نہ کیا کرے اور تم بکری کے تھنوں میں دودھ نہ روکا کرو اور جو کوئی ایسی بکری کو خریدے تو وہ دودھ دوہ لینے کے بعد دو امروں میں سے ایک کا مختار ہے، اگر اسے پسند ہے تو رکھ لے اور اگر پسند نہیں تو اسے واپس کر دے اور ایک صاع تمر بھی (ساتھ دیوے)۔''

---

[1] هداية كتاب البيوع

[2] نجش یہ ہے کہ قیمت بڑھانے کے لیے نمائشی خریدار بن بیٹھے اور خریدنے کا مقصد نہ ہو، چونکہ اس میں بھی دھوکہ ہے اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرما دیا۔ سبحان اللہ!

[3] صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب النهى للبائع۔الخ، حديث: 2150

دیکھیے اس حدیث میں وہ تین امر بھی مذکور ہیں جو "ہدایہ" میں مذکور ہیں اور ان کی بنا حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رکھی گئی ہے تو اگر یہ بزرگ (اللہ ان پر رحمت کرے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہی کی خاطر تصریہ کا حکم بھی لکھ دیتے تو کیسا اچھا ہوتا، سارے مسائل حدیث کے موافق ہو جاتے اور مخالفت دور ہو جاتی۔

اب ایک بات رہ گئی۔ اگر کہا جائے کہ خیر واپسی کا اختیار تو مان لیا، لیکن ایک صاع تمر ساتھ دینے کا حکم کیوں کیا؟ حالانکہ حدیث ہی سے اوپر گزر چکا ہے "الخراج بالضمان"، یعنی محاصل کا حق ضمانت کی وجہ سے مشتری کو ہے، تو مصراۃ کی واپسی میں تو مشتری کو لینے کے دینے پڑ گئے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث "الخراج بالضمان" کے معنی یہ تھے کہ اگر وہ غلام اس مشتری کے پاس ہونے کی حالت میں مر جاتا تو نقصان اس مشتری ہی کا ہوتا، پس اس کی اس عرصہ کی کمائی کا مشتری ہی مستحق ہونا چاہیے اور مشتری کو دودھ کا عوض دینے کا حکم کیا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تصریہ کی حالت میں دودھ جزوِ بیع تھا، یعنی جانور کے ساتھ ہی تھا نیا پیدا نہیں ہوا، پس جب جانور واپس کر دیا تو اس کا دودھ بھی واپس کرنا چاہیے اور وہ دودھ اس دودھ سے مختلط ہو گیا جو بعد سودے کے پیدا ہوا اور ان میں تمیز مشکل تھی، تو اس کے عوض جھگڑا چکانے کے لیے کچھ ادا کرنے کا حکم کیا اور چونکہ عربوں کی عام اور آسان قوت (غذا) کھجور تھی، اس لیے کھجور کا حکم کیا، چنانچہ اس کا ذکر "حجۃ اللہ" کی عبارت میں گزر چکا ہے۔ اور حضرت شیخ الاسلام رسالہ "قیاس" میں "الخراج بالضمان" کے جواب میں فرماتے ہیں:

"وأما قوله: الخراج بالضمان منه باتفاق أهل العلم، مع أنه لا منافاة بينهما فإن الخراج ما يحدث في ملك المشتري ولفظ الخراج اسم للغة اللبن ونحوه فملحق بذلك، وهنا كان اللبن موجودا في الضرع فصار جزءا من البيع ولم يجعل الصاع عوضا عما حدث بعد العقد، بل عوضا من اللبن الموجود في الضرع وقت العقد وأما تضمين اللبن بغيره وتقديره بالشرع فلأن اللبن المضمون اختلط باللبن الحادث بعد العقد فتعذرت معرفة قدره فلهذا قدر

الشرع البدل قطعاً للنزاع، وقدر بغير الجنس لأن التقدير بالجنس قد يكون أكثر من الأول أو أقل فيفضي إلى الربا بخلاف غير الجنس فإنه كان ابتاع لذلك اللبن الذي تعذرت معرفة قدره بالصاع من التمر والتمر كان طعام أهل المدينة ومكيل مطعوم يقتات به كما أن اللبن مكيل مقتات وهو أيضا يقتات به بلا صنعة بخلاف الحنطة والشعير فإنه لا يقتات به إلا بصنعة فهو أقرب أجناس التي يقتاتون بها إلى اللبن، ولهذا كان من موارد الاجتهاد أن جميع الأمصار يضمنون ذلك لمن يقتات التمر فهذا من موارد الاجتهاد كأمره في صدقة الفطر بصاع من شعير أو تمر۔"[1]

"لیکن آپ کا یہ قول کہ محاصل ضمانت کے عوض میں ہے تو اس کا جواب اولاً تو یہ ہے کہ حدیث مصراۃ اس حدیث (الخراج بالضمان) کی نسبت باتفاق اہل علم زیادہ صحیح ہے، علاوہ اس کے یہ کہ ان دونوں میں کوئی منافات نہیں کیونکہ محاصل سے وہ چیز مراد ہے جو مشتری کی ملک میں ہوتے ہوئے پیدا ہو اور لفظ خراج اس محاصل کا نام ہے مثلاً غلام کی کمائی اور دودھ اور مثل اس کی اور چیزیں اس سے ملحق ہیں اور یہاں (مصراۃ کی صورت میں) دودھ تھنوں میں آگے ہی (بیع کے وقت) موجود تھا۔ پس وہ بیع کا جزو ہوگیا۔ اور ایک صاع تمر اس دودھ کا عوض نہیں کیا گیا جو بیع ہو چکنے کے بعد پیدا ہوا، بلکہ اسی دودھ کا عوض ہے جو بیع کے وقت تھنوں میں موجود تھا، اور شریعت نے دودھ کا عوض جو غیر دودھ کو مقرر کیا یعنی کھجوروں کو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دودھ جس کا عوض دلایا گیا ہے، اصل دودھ سے جو بیع منعقد ہو جانے کے بعد پیدا ہوا، مل گیا تو اس کے مقدار کی شناخت نہایت مشکل ہوگئی۔ پس اس لیے شریعت (مطہرہ) نے جھگڑا قطع (ختم) کرنے کے لیے اس کا بدل مقرر کیا اور غیر جنس سے اس لیے مقرر کیا کہ ہم جنس مقرر کرنے میں کبھی زیادتی ہوگی اور کبھی کبھی تو یہ ربا (سودِ بیع) ہو جائے گا اور غیر جنس کے مقرر ہونے میں یہ بات نہیں ہو سکتی، اس

[1] رسالہ قیاس مشمولہ مجموعہ رسائل شیخ الإسلام :257/2

کی صورت تو یہ ہو جائے گی کہ گویا وہ دودھ جس کی مقدار کی شناخت مشکل ہوگئی ہے ایک صاع تمر کے عوض خریدا گیا ہے اور تمر (کھجور) اہل مدینہ کی عام خوارک تھی اور یہ پیمانے سے لی دی جاتی ہے اور بطور غذا کے کھائی جاتی ہے اور اسی طرح دودھ بھی ایسی چیز ہے جو پیمانہ سے لی دی جاتی ہے اور غذا کی چیز ہے، نیز کھجور ایسی خوراک ہے جو بغیر انسانی کسب اور صنعت کے خوراک بنتی ہے اور گیہوں اور جو بھی خورا کی چیزیں تو ہیں لیکن بغیر انسانی کسب اور صنعت کے خوراک نہیں بنتیں، پس کھجور دوسری جنسوں کی نسبت دودھ کے زیادہ قریب جنس ہے اور اس لیے یہ بات اجتہادی امروں میں سے ہے کہ سب شہروں کے لوگ اس کا عوض ایک صاع تمر کر دیا کریں یا یہ امر صرف انہی کے لیے ہے کہ کھجور جن کی خوراک میں ہو، پس یہ بات اجتہادی امروں میں سے ہے، مثل اس حکم کے جو آنحضرت ﷺ نے صدقہ فطر کے متعلق ایک صاع جَو، یا کھجور کا کیا۔''

الحمد للہ کہ حدیث مصراۃ کے متعلق امور ثمانیہ کا بیان تفصیل سے ہو چکا۔ جس سے ثابت ہو گیا کہ حدیث صحیح و ثابت ہے اور اس سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اس سے ہماری اصل غرض صاف ثابت ہے کہ محدثین علیہم الرحمۃ رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث کی پیروی میں قیل وقال اور حیل و حجت نہیں کرتے۔

سچی فقاہت جس کی نسبت آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے:

''من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين''[1]

''اللہ تعالیٰ کو جس کسی کی بھلائی منظور ہوتی ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔''

صرف محدثین رحمہم اللہ کے حصہ میں ہے، جن کی زندگی کا اعلیٰ مقصد حدیث رسول اللہ ﷺ کی خدمت اور اس کی پیروی ہے، ان کا یہ وطیرہ ہرگز نہیں کہ اگر کسی حدیث کی حکمت معلوم نہیں ہو سکی تو اپنی ناقص سمجھ کو کامل و بے خطا سمجھ کر اس (حدیث) کو خلافِ رائے و قیاس یا مخالف قرآن و حدیث مشہور قرار دے کر ٹال دیا جائے۔ والله يهدی من يشاء إلى صراط مستقيم

[1] بخاری کتاب العلم، حدیث: 71

ایک بھاری وہم کا ازالہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت امام صاحب رحمہ اللہ کا طریق اجتہاد محدثین علیہم الرحمۃ کے طریق سے جدا ہے اور آپ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے تھے۔ اس کا جواب تفصیل طلب ہے جس کا بیان مختصراً یہ ہے کہ اس عاجز زلہ ربائے علمائے متقدمین کی تحقیق جو دیانت وادب ہر دو امروں کو ملحوظ رکھ کر ہے، یہ ہے کہ حضرت امام صاحب اہل سنت اور اہلحدیث کے پیشوا تھے جیسا کہ باب اول کے ضمیمہ فصل سوم میں آپ کے خصوصی حالات میں ائمہ اہلحدیث مثل امام ذہبی اور حافظ ابن حجر اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ کے اقوال سے گزر چکا ہے اس کے علاوہ اس موقع پر آپ کے طریق اجتہاد کا یہاں مختصراً یہ ہے کہ دلائل شرع کے اصول اجتہاد یا مبنائے قیاس تین امر ہیں: قرآن، حدیثِ صحیح اور اجماع امت۔

اور چوتھی دلیل وہ قیاس ہے جو (قواعد مسلّمہ ومقررہ کے رو سے) ان تینوں میں سے کسی ایک سے مستنبط ہو، اس تفصیل سے جو ہم نے بیان کی کسی امام حدیث یا امام فقہ کو انکار نہیں، ہاں شرائط تنقید واعتبار میں جس طرح بعض مقامات میں دیگر محدثین میں اختلاف ہے اسی طرح بعض شروط میں امام صاحب رحمہ اللہ کا بھی اختلاف ہو تو یہ قابل گرفت نہیں، اصول حدیث اور اصول درایت پر نظر رکھنے والے علماء سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے، چنانچہ نور الانوار کے متن منار میں ہے:

”اعلم أن أصول الشرع ثلاثة: الكتاب والسنة وإجماع الأمة، والأصل الرابع القياس“[1]

”جان تو کہ دلائل شرع کے تین ہیں، قرآن شریف اور حدیث شریف اور اجماع امت اور چوتھی دلیل قیاس ہے۔“

اس کی شرح میں ملا احمد رحمہ اللہ صاحب (استاد غازی عالمگیر رحمہ اللہ) نور الانوار میں فرماتے ہیں:

”هو القياس المستنبط من هذه الأصول الثلاثة“[2]

---

[1] نور الانوار، ص: 6، 7

[2] نور الانوار ص: 7، مطبوعہ لکھنو

''وہ قیاس دلیل شرعی ہوسکتا ہے جو ان تین اصول (مذکورہ) سے مستنبط ہو۔''

علاوہ اس کے ہم حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تہذیب التہذیب سے ایک خاص حوالہ ذکر کرتے ہیں، جس سے امام صاحب رحمہ اللہ کا مذہب نہایت صفائی سے معلوم ہوجائے گا اور سب وہم دور جائیں گے وہ یہ کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں یحییٰ بن ضریس کہتے ہیں کہ میں امام سفیان رحمہ اللہ کی مجلس میں حاضر تھا کہ آپ کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھنے لگا کہ آپ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ میں کیا عیب پاتے ہیں؟ امام سفیان رحمہ اللہ نے سوال کیا: کیوں، ان کو کیا ہے؟ اس شخص نے کہا: میں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو فرماتے سنا:

''میں پہلے اللہ کی کتاب (قرآن) کو لیتا ہوں اگر وہ مسئلہ اس میں نہیں پاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو لیتا ہوں اگر اس میں نہیں پاتا تو صحابہ رضی اللہ عنہم سے جس کا قول پسند کرتا ہوں لے لیتا ہوں اور ان کے قول کو چھوڑ کر کسی اور طرف نہیں جاتا، لیکن جب ابراہیم نخعی، شعبی، محمد بن سیرین اور عطا (بن رباح) تک نوبت آجائے تو یہ ایسے لوگ ہیں، جنہوں نے اجتہاد کیا تھا سو جس طرح انہوں نے اجتہاد کیا تھا، میں بھی اجتہاد کرتا ہوں۔''①

یہ عبارت امام صاحب رحمہ اللہ کا مسلک بتانے میں بالکل صاف ہے علاوہ اس کے یہ معلوم کل ہے کہ آپ مرسل② روایت کو امام مالک رحمہ اللہ کی طرح مطلقاً حجت مانتے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہے کہ آپ قیاس کے مقابلہ میں ضعیف حدیث کو مقدم جانتے تھے کہ ضعیف کا ضعف عارضی ہے جس میں احتمال صحت کا ہوسکتا ہے لہٰذا اس کے مقابلہ میں قیاس کی ضرورت نہیں بھلا وہ شخص جو صحابی کے قول کے سامنے بھی قیاس نہ کرتا ہو وہ صحیح حدیث کو عمداً کس طرح ترک کرسکتا ہے۔ فتنبہ

(منقول از ''تاریخ اہلحدیث'' ص:205، 273)

وللہ الحمد

❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊

① تهذيب التهذيب: 451/10

② مرسل روایت کی حجیت اور اس میں امام شافعی رحمہ اللہ کے اختلاف کا ذکر سابقاً باب دوم میں امام شافعی رحمہ اللہ کے ذکر میں مجملاً ہو چکا ہے۔

عورت کے لیے پردے کا وجوب اس کے احکام وآداب

حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ

حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ عصر حاضر کے ممتاز مصنف اور علم دین میں عظیم حیثیت کی مالک شخصیت ہیں ۔ آپ گزشتہ سال 12 جولائی 2020 کو ہمیں دادِ مفارقت دے گئے ۔ اور اپنے پیچھے علم کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ کر گئے جس سے آج بھی امت مسلمہ سیراب ہورہی ہے وللہ الحمد۔ معاشرے کے سلگتے مسائل پر آپ بہت ہی زبردست اور عمدہ تحقیق پیش کیا کرتے تھے ۔ آپ کی تحریروں میں اخلاص اور للّٰہیت نمایاں نظر آتی ہے ۔ آپ رحمہ اللہ عرصہ دراز تک المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کے شعبہ تحقیق وتالیف کے سربراہ بھی رہے ۔ اور اپنے قلم سے اس ادارے کے تحت تحقیق کے عظیم کارہائے نمایاں بھی پیش کیئے جن میں سرفہرست :

- حقوق مرداں اور حقوق نسواں
- امین احسن اصلاحی اپنے حدیثی وتفسیری نظریات کی روشنی میں
- اور فکر فراہی اور اس کے گمراہ کن اثرات ایک علمی وتحقیقی جائزہ
- جنازے کے احکام ومسائل

نمایاں ہیں ۔ حافظ رحمہ اللہ کی کتابیں خالص کتاب وسنت کی دعوت اور دلائل سے مزین ہیں ۔ اسی امتیاز کے پیش نظر ادارہ نے یہ فیصلہ کیا ہے اپنے سہ ماہی البیان کی سلسلہ وار اشاعت میں حافظ صاحب کی ان تحریروں کو گاہے بگاہے شائع کرتے رہیں گے تاکہ ہر خاص وعام اس سے مستفید ہوسکے اور لوگوں کو نئے پیش آمدہ مسائل میں کتاب وسنت سے خالص رہنمائی مل سکے ۔ واللہ من وراء القصد ۔ (ادارہ)

پردے کا حکم اور مردوں سے اختلاط کی ممانعت

مسلمان عورت کے لیے پردے کا حکم بھی ان امتیازات میں سے ہے جن کی وجہ سے وہ مردوں سے ممتاز اور اسلام دوسرے مذاہب سے ممتاز ہے، پردے کے حکم کا مقصد مسلمان عورت کا تحفظ ہے۔ مسلمان عورت کی عزت وناموس اور اس کی کرامت ونجابت کی حفاظت اور اس کو شبہات سے بچانے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک تو مرد اور عورت کو باہمی اختلاط، یعنی مل کر پڑھنے مل کر کام کرنے مل کر بے محابا گفتگو کرنے اور بے باکانہ میل ملاقات سے روک دیا ہے۔ اور دوسرے، عورت کے لیے حجاب (پردے) کی پابندی کو ضروری قرار دیا ہے۔ پس عورت کے پردہ ایسے درخت کی حیثیت رکھتا ہے جس کے سائے میں وہ سکون محسوس کرتی اور اس کے دامن میں پناہ حاصل کرتی ہے۔

حجاب، کوئی قید اور قدغن نہیں جس سے گھٹن محسوس کی جائے، کوئی بوجھ نہیں جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیر کی جائے اور کوئی ناروا پابندی نہیں جس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے جیسا کہ اسلام دشمن عناصر، لادین قسم کے لوگ اور مغرب زدہ حضرات باور کراتے ہیں بلکہ پردے کا حکم اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام نے عورت کو ایک نہایت بیش قیمت متاع قرار دیا ہے، اسی لیے اس کی حفاظت وصیانت کا خصوصی اہتمام کیا ہے کیونکہ ہر قیمتی چیز کو چھپا کر رکھا جاتا اور اس کی حفاظت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس لیے دشمنوں کے مکر وفریب کو سمجھنا، ان کے حسین جالوں سے بچنا اور ان کی سازشوں کو ناکام بنانا ضروری ہے۔

بنابریں ہر مسلمان عورت حجاب کے شرعی تقاضوں کی پابندی کر کے اپنے ایمان کی بھی حفاظت کرے اور دشمنانِ اسلام کے مذموم اور مکروہ عزائم کو بھی خاک میں ملا دے۔

پردے کی اہمیت اور اس کی افادیت وضرورت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور مارکیٹ میں اس موضوع پر بہت مواد موجود ہے۔ اس لیے ذیل میں صرف بے پردگی کی مختلف شکلوں اور ان پر ہونے والی وعید، نیز شرعی پردے کے آداب وشرائط اور اختلاط کی ممانعت کے ضروری مسائل بیان کیے جاتے ہیں تاکہ ہر مسلمان عورت ان کو سامنے رکھے اور ان کی پابندی کرے۔ مردوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی جوان بچیوں، بہنوں، ماؤں اور بیویوں کو تلقین کریں کہ وہ ہر جگہ، گھر کے اندر ہوں یا گھر سے باہر، ان پابندیوں کا اہتمام کریں۔

بے پردگی پر سخت وعید اور اس کی مختلف شکلیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

’’صِنْفَانِ مِنْ أَهْلِ النَّارِ لَمْ أَرَهُمَا : قَوْمٌ مَعَهُمْ سِيَاطٌ كَأَذْنَابِ الْبَقَرِ يَضْرِبُونَ بِهَا النَّاسَ، وَنِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ، مُمِيلاَتٌ مَائِلاَتٌ، رُءُوسُهُنَّ كَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ ، لاَ يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلاَ يَجِدْنَ رِيحَهَا ، وَإِنَّ رِيحَهَا لَتُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ كَذَا وَكَذَا‘‘[1]

’’جہنمیوں کی دو قسمیں جنہیں میں نے دیکھا نہیں، یعنی ابھی ان کا وجود نہیں ہے، مستقبل میں ہوگا۔ ایک وہ لوگ کہ ان کے پاس گائے کی دُموں جیسے کوڑے ہوں گے، وہ ان سے لوگوں کو ماریں گے۔ (دوسری قسم) وہ عورتیں جو لباس پہننے کے باوجود برہنہ ہوں گی، مائل کرنے والی اور مائل ہونے والے ہوں گی، ان کے سر بختی اونٹ کی کوہان کی طرح جھکے ہوئے ہوں گے۔ یہ عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی بلکہ اس کی خوشبو تک نہ پائیں گی، حالانکہ اس کی خوشبو اتنی اتنی مسافت، یعنی بڑی بڑی دور سے آتی ہے۔‘‘

تشریح وتوضیح

یہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات میں سے ہے، آپ نے اس میں جن دو قسم کے لوگوں کی پیش گوئی فرمائی تھی، آج قدم قدم پر ان کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر عورت کی جن فتنہ سامانیوں اور حشر انگیزیوں کا اس میں تذکرہ ہے، وہ محتاج وضاحت نہیں۔ بہرحال ذیل میں اس کی کچھ توضیح کی جاتی ہے۔

پہلی قسم سے تو ظالم لوگ مراد ہیں، جو اپنے وسائل، طاقت واقتدار اور جاہ ومنصب کی بنیاد پر لوگوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ کرتے ہیں۔ دنیا میں یہ لوگ طاقت کے نشے میں اندھے اور مغرور ہوتے ہیں، اس لیے رحم وکرم کی بجائے ظلم وستم ان کا شعار ہوتا ہے۔ آخرت میں اسکا نتیجہ یہ

[1] صحیح مسلم۔اللباس والزینة، باب النساء الکاسیات العاریات المائلات الممیلات،حدیث:2128

ہوگا کہ ایسے لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ (أعاذنا الله منه)

جہنمیوں کی دوسری قسم فیشن ایبل عورتوں کی ہوگی۔ ان کی حسبِ ذیل علامات اور خصوصیات ہوں گی:

❁ **لباس پہننے کے باجود برہنہ ہوں گی اس کی تین شکلیں عام ہیں۔**

1. لباس پہننے کے باوجود ان کے جسم کے بہت سے قابل ستر حصے ننگے ہوں گے، جیسے چہرہ، ہاتھ یا بازو، گردن اور سینہ (چھاتی اور گردن کا پچھلا حصہ) عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جن کے یہ حصے ننگے ہوتے ہیں حالانکہ یہ سب حصے پردے میں رہنے چاہئیں۔
2. ایسا تنگ اور چست لباس پہنیں گی کہ جس سے جسم کے خدوخال ہی نہیں، انگ انگ نمایاں ہوگا۔
3. یا ایسا باریک لباس پہنیں گی کہ جس سے سارا جسم چھلکتا نظر آئے گا اور ان کا حسن نمایاں ہوگا۔

یہ تینوں صورتیں بے پردگی کی ہیں جن سے مردوں کو دعوت نظارہ ملتی ہے، مسلمان خواتین کو، جو پردے کی اہمیت کو سمجھتی ہیں، غیر محرموں کے سامنے مذکورہ تینوں صورتوں سے بچنا چاہیے۔ اس کے بغیر پردے کے تقاضے پورے نہیں ہوسکتے۔

[ممیلات] کے ایک معنی ہیں، دوسری عورتوں کو بھی مردوں کی طرف راغب کرنے والیاں، یا مردوں کو اپنی طرف مائل کرنے والیاں، یا اپنے کندھوں کو ناز وادا سے مٹکا مٹکا کر چلنے والیاں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی چال ڈھال یا ناز وادا سے مردوں کو اپنی طرف مائل کرنا اور دوسری عورتوں کو بھی بے حیائی کی اس راہ پر لگانا، جیسے فلموں اور ڈراموں میں کام کرنے والی حیا باختہ عورتوں کا کردار ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کردار کسی حیادار، باعفت اور پاک باز عورت کا نہیں ہوسکتا۔

[مائلات] کے معنی ہیں، ناز وادا سے ایسی چال چلنا یا ایسی حرکات وسکنات کرنا جن سے معلوم ہو کہ عورت مردوں کی طرف میلان رکھتی ہے۔

بختی اونٹ کی کوہان کی مانند ان کے سر ہوں گے، کا مطلب سر پر جوڑا کر کے بالوں کو سر کے درمیان اونچا کر کے باندھ لینا، یہ فیشن بھی بہت سی عورتیں کرتی ہیں حتیٰ کہ بعض برقع پوش خواتین کے سروں پر بھی اس طرح کی کلغی نظر آتی ہے۔اس حدیث کی رُو سے بالوں کا یہ اسٹائل یا فیشن بھی ناپسندیدہ ہے۔

حدیث کی وارد سخت وعید کی مصداق عورتیں

مذکورہ وضاحت سے یہ بات بطور خاص معلوم ہوتی ہے کہ جو عورتیں پردے کے شرعی تقاضوں سے بے اعتنائی برتتی ہیں اور ایسا لباس پہنتی ہیں جس سے جسم کے کچھ حصے ننگے رہتے ہیں، جیسے بے آستین کی قمیص، یا کھلے گلے والی قمیص جس سے ان کی چھاتی نظر آتی ہے، یا ان کی گردن کا پچھلا حصہ ننگا رہتا ہے۔، یا چہرہ نظر آتا ہے یا سر ننگا رہتا ہے، یا ساڑھی ہے جس میں پیٹ ننگا رہتا ہے، یا یورپ اور امریکہ میں مروجہ منی سکرٹ ہے جس میں ٹانگیں ننگی رہتی ہیں، یا ایسا باریک لباس جس سے ان کے جسم کا سارا حسن چھن چھن کے باہر آتا ہے، یا ایسا کسا کسا یا چست لباس جس سے ان کی جسمانی ساخت اور حسن نمایاں ہوتا ہے، یہ سب بے پردگی کی صورتیں ہیں اور ایسا لباس پہننے والی عورتیں مذکورہ وعید کی مصداق ہیں۔

اسی طرح اپنی چال ڈھال، ناز و ادا اور اٹکھیلیوں، اور اشاروں کنایوں پر مبنی بے حیائی کے فیشن اختیار کر کے مردوں کو اپنی طرف راغب کرنا، یہ بھی سخت گناہ ہے جو مذکورہ وعید کا مصداق بنا سکتا ہے کیونکہ عورت کا سارا حسن و جمال اور اس کی زیب و زینت صرف اور صرف اس کے خاوند کے لیے ہے اور جس عورت کا مقصد خاوند کے علاوہ دوسرے مردوں کو اپنی طرف راغب کرنا اور انہیں دعوتِ گناہ دینا ہے، ایسی ہرجائی عورتیں جنت کی خوشبو تک نہیں پائیں گی۔

شادی بیاہ میں ویڈیوز اور حسن و جمال کی نمائش کی وبا

آج کل شادی بیاہ کی تقاریب میں عورتوں نے نہ صرف پردے کو خیر باد کہہ دیا ہے بلکہ وہ ایسا فیشن کر کے اور ایسا لباس پہن کے ان میں شریک ہوتی ہیں جیسے وہ مقابلۂ حسن یا مقابلۂ آرائش

وزیبائش یا مقابلۂ زیورات میں شریک ہورہی ہیں، پھر ان کے لباس، میک اپ اور حرکت وادا میں بے پردگی اور بے حیائی کی تقریباً تمام مذکورہ صورتیں پائی جاتی ہیں۔علاوہ ازیں ان کی یہ ساری چیزیں ویڈیو کے ذریعے سے فلم بند ہوجاتی ہیں جنہیں خاندان کے محرم اور نامحرم سب مرد ذوق وشوق سے دیکھتے اور ان کے حسن وجمال سے یا ان کے فیشنی بالوں اور لباسوں سے ان کی چال ڈھال اور ناز وادا سے متاثر یا محظوظ ہوتے ہیں۔

- کیا ایک اسلامی معاشرے میں مسلمان عورتوں کا یہ رویہ جائز ہے؟
- کیا مسلمان عورتوں کے لیے بے حیائی کا یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے؟
- کیا مسلمان مردوں کی یہ ذمے داری نہیں ہے کہ وہ اپنی عورتوں (بیویوں، بچیوں) کو اس طرح کا لباس اور فیشن اختیار کرنے سے روکیں؟
- کیا ویڈیو کے ذریعے سے اس بڑھتی ہوئی بے حیائی کا سدّ باب کرنے کی ضرورت نہیں؟
- کیا عورتوں کی اس بے پردگی اور حسن وجمال کی نمائش پر خاموش رہنے والے مرد بھی عورتوں کے ساتھ حدیث میں وارد شدید وعید کے مصداق نہیں ہوں گے؟

یہ الم ناک صورت حال ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے، کاش ہم اس پر کچھ غور کرسکیں!

پردے کا حکم اور اس کے آداب

پردے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کے تقاضوں کی ادائیگی کے لیے علماء نے اس کے آٹھ آداب بیان فرمائے ہیں تاکہ صحیح معنوں میں پردہ ہوسکے، ان آداب وشرائط کے بغیر شرعی پردہ نہیں ہوتا یہ آداب حسب ذیل ہیں:

- چادر یا برقع ایسا ہو جو سر سے لیکر پیروں تک پورے جسم کو ڈھانپ لے، چہرہ نظر آئے نہ بازو، چھاتی نظر آئے نہ گدی، حتیٰ کہ ہاتھ اور پیر بھی نظر نہ آئیں۔
- چادر یا برقع بھی بجائے خود زینت، یعنی جاذب نظر نہ ہو، جیسے اس پر کڑھائی کا کام کیا گیا ہو یا پرکشش رنگ کا حامل ہو یا اتنا خوب صورت اور نفیس ہو کہ بے اختیار مردوں کی

نظریں عورت کی طرف اٹھ جائیں۔ گویا مذکورہ قسم کی چادر یا برقعے سے بھی پردے کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔

❁ حجاب، ایسے باریک اور شفاف کپڑے کا نہ ہو جس میں عورت کا جسم جھلکے، گویا چادر یا برقعے کا کپڑا سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ موٹا بھی ہو۔

❁ حجاب ڈھیلا ڈھالا ہو، اس طرح تنگ نہ ہو کہ فتنے میں ڈالنے والی جگہیں واضح ہوں یا اس سے جسمانی ساخت اور اس کے خدوخال کی غمازی ہوتی ہو۔

❁ اس کے کپڑے سینٹ یا خوشبو سے معطر نہ ہوں۔

❁ مردوں کے سے لباس کی طرح نہ ہوں۔

❁ اسی طرح کافر عورتوں کے لباس کی طرح نہ ہوں، جیسے منی سکرٹ، ساڑھی، لہنگا وغیرہ کیونکہ کافروں کی مشابہت بھی ممنوع ہے۔ فرمانِ نبوی ہے:

''مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ'' [1]

''اور جو جس کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انہی میں سے ہوگا۔''

شہرت و ناموری والا لباس نہ ہو کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''مَن لَبِسَ ثوبَ شُهرةٍ أَلْبَسَهُ اللّٰهُ يومَ القيامةِ مِثْلَهُ'' ابوعوانہ کی روایت میں ہے ''ثم تلهب فيه النار'' [2]

''جس نے شہرت کا لباس پہنا، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اس جیسا ہی لباس پہنائے گا، پھر اس میں جہنم کی آگ کو بھڑکایا جائے گا۔''

کن کن لوگوں سے پردہ ضروری اور اختلاط (میل جول) منع ہے

لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت کے لیے پردہ اسی وقت ضروری ہے جب وہ گھر سے باہر نکلے اور اسی طرح میل جول بھی صرف انہی سے منع ہے جو بیگانے ہیں ورنہ گھر میں وہ اپنے رشتے داروں کے

---

[1] سنن أبي داؤد، اللباس، باب في لبس الشهرة، حديث: 4031

[2] سنن أبي داؤد، اللباس، باب في لبس الشهرة، حديث 4029

ساتھ جس طرح چاہے میل جول رکھے، ان سے ہنسی مذاق کرے اور ان سے خلوت وجلوت میں بے باکانہ گفتگو کرے، اس میں کوئی حرج ہے نہ یہ پردے کے منافی ہے حالانکہ یہ بات غلط ہے۔

ایسے گھروں میں جہاں خاوند کے دوسرے بھائی بھی رہتے ہوں عورت کو ڈھیلے ڈھالے اور ساتر لباس میں رہنا چاہیے، جس سے عورت کے بازو نظر آئیں نہ چھاتی اور نہ کوئی اور چیز ہی کیونکہ عورت کے لیے دیوروں اور جیٹھوں سے پردہ کرنا بھی ضروری ہے اور یہ پردہ اس طرح نہایت آسانی سے ممکن ہے کہ ایک تو مذکورہ انداز میں ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے جس سے اس کی زینت کا اظہار اور فتنے والی جگہیں آشکارا نہ ہوں۔ دوسرے، دیور اور جیٹھ وغیرہ کے سامنے آنے پر گھونگٹ نکال لے۔ علاوہ ازیں ان سے بے باکانہ انداز میں گفتگو نہ کرے بلکہ حسب ضرورت مختصر بات کرے اور ان کے ساتھ تنہائی بالکل اختیار نہ کرے۔

شرعی ہدایات کی روشنی میں جن جن رشتے داروں سے پردہ کرنا ضروی اور ان سے اختلاط منع ہے۔ ان کی تفصیل علماء کی وضاحت کی روشنی میں حسب ذیل ہے۔

❁ عورت کا اپنے چچازاد، ماموں زاد، خالہ زاد اور پھوپھی زاد بھائی سے اختلاط

❁ عورت کا اپنے دیور، جیٹھ، بہنوئی سے اختلاط۔

❁ عورت کے رضاعی بھائی کا اپنی رضاعی بہن کی دیگر بہنوں سے اختلاط۔

مذکورہ تمام اختلاط ممنوع ہیں۔ اختلاط کا مطلب ان سے بے پردہ ہو کر بلا تکلف گفتگو اور ہنسی مذاق کرنا اور خلوت میں بھی ان سے ملاقات کرنا ہے۔

❁ منگیتر کا اپنی منگیتر سے اختلاط بھی ممنوع ہے البتہ نکاح سے قبل ولی کی موجودگی میں اسے ایک نظر دیکھ لینا مستحب ہے۔

❁ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں بیروں یا نوجوان لڑکوں کا عورتوں کی خدمت پر مامور ہونا۔

❁ دولھا، دلھن کا اپنے رشتے داروں کے ساتھ یا مرد و زن کا گروپ کی صورت میں بیٹھنا اور تصویریں اتروانا وغیرہ۔

❁ عمر رسیدہ خواتین کا اجنبی مردوں کے ساتھ تنہائی میں خلوت اختیار کرنا۔

❁ عورت کا اجنبی مردوں کے ساتھ اختلاط، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ تو ہمارے ہی قبیلے یا برادری کے افراد ہیں، یا اصل پردہ تو دل کا پردہ ہے یعنی دل پاکیزہ ہوں، آنکھ میں حیا ہو تو یہی پردہ ہے، جسمانی پردہ ضروری نہیں۔

ان بچیوں کے ساتھ اختلاط میں تساہل برتنا جو قریب البلوغت ہوں، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ تو ابھی بچیاں ہیں۔

❁ بغیر محرم کے عورت کا حج کے سفر پر جانا۔

❁ کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر مدارس میں ہوم ٹیوشن کے نام پر عورتوں کا بچوں اور بچیوں اور مردوں کو پڑھانا یا مردوں کا عورتوں کو پڑھانا، یا کالجوں وغیرہ میں مخلوط تعلیم کا ہونا۔

❁ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے نام پر مغرب کی یونیورسٹیوں میں بھیجنا، انہیں مغربی افکار اور اس کی حیا باختہ تہذیب کا شکار بنانا ہے۔

❁ اعلیٰ تعلیمی اداروں اور طبی تجربہ گاہوں میں عملی تربیت کے نام پر لڑکے لڑکیوں کا اختلاط۔

❁ یونیورسٹیوں میں ایم اے اور پی ایچ ڈی وغیرہ کے مقالات کی تیاری میں بطور رہنما اور نگران کے مردوں کا عورتوں کے ساتھ خلوت (تنہائی) میں میل ملاقات۔

❁ علمی اجتماعات، کانفرنسوں، مشاعروں اور دیگر اس قسم کی تقریبات میں مرد و عورت کا پہلو بہ پہلو بیٹھنا۔

❁ نرسوں اور خاتون ڈاکٹر کا اجنبی مردوں، حتیٰ کہ ڈاکٹروں اور ہسپتال کے دیگر مرد ملازمین کے ساتھ اختلاط۔

❁ ڈاکٹر کی غیر محرم مریضہ کے ساتھ خلوت۔

❁ بغیر حاجت یا ضرورت کے یا لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی میں عورت کا مرد ڈاکٹر کے سامنے چہرہ وغیرہ ننگا کرنا۔

❁ دکان شوروم یا مارکیٹوں وغیرہ میں عورت کا مردوں سے اختلاط۔

❁ بغیر محرم کے عورت کا رکشے، ٹیکسی، بس ریل یا ہوائی جہاز میں سفر کرنا۔

❁ عورتوں کا فوٹو گرافروں سے تصویریں کھنچوانا۔

❁ بدعات پر مبنی اجتماعات (جیسے میلاد وغیرہ) اور تبلیغی جلسوں میں مردوں اور عورتوں کا اختلاط۔

❁ اختلاط کی مذکورہ تمام صورتیں اور اس قسم کی دوسری صورتیں جن کی شرعاً اجازت نہیں، سب ممنوع اور حرام ہیں۔ مغربی تہذیب کی نقالی میں بے پردگی وبائے عام کی شکل اختیار کرگئی ہے جس کی وجہ سے اب مرد وعورت کے اختلاط میں لوگ کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔

❁ بنابریں مسلمان عورتوں کو اختلاط کی مذکورہ صورتوں سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مردوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں، ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو پردے کی اہمیت وضرورت سے آگاہ کریں اور بے پردگی اور مردوں سے اختلاط کے مفاسد وخطرات سے بھی انہیں خبردار کریں تاکہ وہ ان سے بچنے کا اہتمام کریں۔

محارم کی وضاحت جن سے پردہ ضروری نہیں

عورت کا جن مردوں سے اختلاط ممنوع اور ان سے پردہ ضروری ہے، ان سے مراد اجنبی مرد ہیں اور اجنبی مرد کون ہیں۔ تو یاد رکھیے، خاوند اور محرم کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں وہ سب شریعت کی رو سے اجنبی ہیں اور محرم سے مراد حسب ذیل رشتے دار ہیں۔

نسبی محارم: باپ، دادا (اوپر تک) بیٹا، پوتا (نیچے تک) بھائی، تایا، چچا، ماموں، بھانجا، بھتیجا، نانا اور نواسا۔

سسرالی محارم: سسر، داماد، خاوند کا بیٹا

رضاعی محارم: رضاعت سے ثابت ہونے والے مذکورہ رشتے کیونکہ حدیث میں ہے: ''رضاعت سے بھی وہ تمام رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب سے ہوتے ہیں۔''[1]

ان مذکورہ رشتوں میں سے کسی کے ساتھ عورت کا نکاح نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ سب عورت کے محرم ہیں، ان سے پردہ کرنا ضروری نہیں۔ ان کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں، سب غیر محرم ہیں اور ان سے پردہ کرنا ضروری ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، الرضاع، باب یحرم من الرضاعِ مایحرم من الولادۃ، حدیث :1444

مثالی مسلمان عورت کی صفات

اے مسلمان بہن! اپنی حیثیت اوراس عزت وتکریم پر غور کر جس سے اللہ نے تجھے نوازا ہے۔ ہر قیمتی چیز اگر وہ ٹوٹ جائے یا ضائع یا چوری ہو جائے، اس کا بدل ممکن ہے لیکن اگر تیری عفت وعصمت داغ دار ہو جائے، تیری عزت وتکریم کو بٹہ لگ جائے اور تیری شرافت ونجابت موضوعِ بحث بن جائے تو اس کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔ تیرا سب سے قیمتی جوہر، تیری عزت وعصمت ہے جو لٹ جائے تو کوئی اس کا معاوضہ نہیں دے سکتا۔

تیری ردائے تقدس اگر تار تار ہو جائے تو اس کا ازالہ نہیں ہوسکتا
تیرا آبگینۂ ناموس اگر ٹوٹ جائے تو کوئی اسے جوڑ نہیں سکتا

پس تیری عزت اسی میں ہے کہ تو اپنی عصمت کی، اپنے تقدس کی چادر کی اور اپنے آبگینۂ ناموس کی حفاظت کر۔ یہ حفاظت کس طرح ممکن ہے؟ یہ اس طرح ممکن ہے کہ تو کچھ چیزوں کو اختیار کر اور کچھ چیزوں سے اجتناب کر۔

عورت کے لیے اختیار کرنے والے اہم کام

مسلمان عورت کے لیے جن چیزوں کو اختیار کرنا اور اپنانا لازم ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

❁ اے مسلمان بہن! تجھے محبت ہو، صرف اللہ سے، اللہ کے رسول سے اور ان لوگوں سے جو اللہ کے دین کے پابند ہیں۔

❁ تیری خلوت ہو، آخرت کی یاددہانی اور ایسے اعمال پر غور کرنے کے لیے جو تیری قبر سے ظلمتوں کو دور کرنے کا باعث اور لحد کی تنگیوں کو فراخی میں بدلنے کا ذریعہ ہوں۔

❁ تیری سہلیاں صرف وہ ہوں جو حقیقی مسلمان ہوں اور اللہ کے دین کی مکمل پابند ہوں۔ تیرے دشمن ہوں، ہر قسم کے گانے بجانے کے آلات (ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر، کیبل، ڈش وغیرہ) اور تمام ایسے رسائل واخبارات جو بے حیائی پر مبنی مضامین، تصویریں اور گمراہ کن افکار وتصورات شائع کرتے ہیں، بے پردہ اور کھلے عام زیب وزینت کا اظہار کرنے والی

ہر عورت اور ہر وہ شخص جو رب کی ناراضگی پر مبنی کام کرنے والا ہو۔

❁ تجھے نفرت ہو، یہود ونصاریٰ سے، منافقین سے، لادینوں سے اور آزادی نسواں کے پرفریب نعرے لگا کر عورتوں کو گمراہ کرنے والوں سے۔

❁ تجھے حرص ہو، خالص اور سچی توبہ کی، نہ کہ محض زبان سے جھوٹی توبہ کی۔

❁ تیرا مقصد زندگی ہو، بارگاہِ الٰہی میں استغفار، آخرت کی تیاری اور رضائے الٰہی کا حصول۔

❁ تیری معاشرتی تقریبات، پاک ہوں جاہلانہ رسموں سے، بینڈ باجوں سے، آتش بازی کے خطرناک مظاہرے سے، میوزک کی دھنوں سے، رقص وسرور کی محفلوں اور شراب وشاہد کی سرمستیوں سے، ویڈیو سے، زیورات اور کپڑوں کی نمائش اور میک اپ کے ذریعے سے برپا ہونے والے نور ونکہت کے طوفان سے، جہیز اور بری کی مسرفانہ رسموں سے، بے پردگی اور مردوں کے اختلاط سے۔

❁ تیری آرزو، خواہش اور کوشش ہو، ایک مسلمان خاندان کی بنیاد ڈالنے کی، اپنی نسل کی اسلامی خطوط پر تربیت کرنے کی اور اس میں اسلامی روح وجذبہ پیدا کرنے کی۔

وہ کام جن سے اجتناب کرنا عورت کے لیے ضروری ہے

مسلمان عورت کو جن چیزوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے وہ حسب ذیل ہیں:

❁ دینی اقدار وروایات کا استہزاء واستخفاف کرنے والوں سے اجتناب

❁ دین میں بدعات ایجاد کرنے اور بدعات میں حصہ لینے سے اجتناب

❁ نماز چھوڑ دینے یا بلا وجہ اس میں تاخیر کرنے سے اجتناب

❁ غیر مردوں کے سامنے زیب وزینت کے اظہار اور بے پردگی سے اجتناب

❁ غیبت، لعن طعن اور چغل خوری سے اجتناب

❁ کافر اور مغرب کی اخلاق باختہ عورتوں کی تقلید سے انہیں اچھا سمجھنے سے اجتناب

بغیر ضرورت کے گھر سے نکلنے سے اجتناب

❁ فکرِ آخرت سے غفلت اور خاوند کی ناشکری کرنے سے اجتناب

❁ خاوند اور والدین کی نافرمانی سے اجتناب

❁ بے حیا بنانے والے اخبارات، رسالوں اور اسی قسم کے دیگر آلات ورسائل سے اجتناب

مذکورہ تمام باتوں سے اجتناب، مثالی مسلمان عورت بننے کے لیے ضروری ہے

یہ چند ضروری ہدایات ہیں جن کی مخاطب ہر مسلمان ماں، بہن، بیٹی، طالبہ اور استانی اور جوان اور بوڑھی خاتون ہے، ان میں دین ودنیا کی سعادتیں ہیں۔ لہٰذا انہیں چاہیے ان پر عمل کر کے ان سعادتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیں اور فوز وفلاح کو اپنا مقدر بنا لیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

مسئلہ سماع موتی

حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ

بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ قبر والوں کو زیارتِ قبور کے وقت دعا میں جو سلام کیا جاتا ہے اور وہ بھی ان سے خطاب کر کے، تو کیا وہ سنتے اور جواب دیتے ہیں؟ اگر وہ سنتے ہیں تو کیا ہم ان سے اور باتیں بھی کر سکتے ہیں؟ نیز اپنی حاجتیں بھی ان کے سامنے پیش کر سکتے ہیں؟

اس کی بابت مختصراً عرض ہے کہ سماعِ موتی کی نہ مطلقاً نفی کی جا سکتی ہے اور نہ مطلقاً اس کا اثبات۔ اس کے بارے میں قول ناطق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کوئی بات سنوانا چاہے تو وہ سن لیتے ہیں، ورنہ عام حالات میں وہ نہیں سنتے۔ اس لیے ہم اگر کوئی بات ان کو سنوانا چاہیں تو نہیں سنوا سکتے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے پیغمبر کی بابت فرمائی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَآءُ ۖ وَمَآ أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ﴾ (الفاطر:22)

''اللہ تعالیٰ جس کو چاہے، سنوا سکتا ہے اور اے پیغمبر تو جس کو چاہے نہیں سنوا سکتا۔''

جس طرح حدیث میں آتا ہے کہ جب مردے کو دفنا کر لوگ واپس جاتے ہیں تو وہ «إِنَّهُ يَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ»[1] ''ان کے قدموں کی (واپسی کی) آہٹ سنتا ہے۔''

اسی طرح جب جنگ بدر میں مارے جانے والے کافروں کی لاشیں ایک پرانے کنویں میں پھینک دی گئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنویں کے پاس کھڑے ہو کر ان لاشوں سے خطاب کیا، یعنی ان میں سے ایک ایک کا نام لے کر، اے فلاں ابن فلاں! اے فلاں ابن فلاں! فرمایا: ''کیا تمہیں یہ بات اچھی لگتی ہے کہ تم نے اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کی

---

[1] صحيح البخاري، الجنائز، باب ماجاء في عذاب القبر، حديث: 1374۔

ہوتی، اس لیے کہ ہم سے اللہ نے جو وعدہ کیا تھا ہم نے اسے حق پایا۔ کیا تم نے بھی تم سے جو وعدہ تمہارے رب نے کیا تھا، حق پایا؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ باتیں سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا:

«يَا رَسُولَ اللّٰهِ! مَا تُكَلِّمُ مِنْ أَجْسَادٍ لَّا أَرْوَاحَ لَهَا»

''اللہ کے رسول! آپ ایسے جسموں سے باتیں کر رہے ہیں جن میں روحیں نہیں ہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! مَا أَنْتُمْ بِأَسْمَعَ لِمَا أَقُولُ مِنْهُمْ» [1]

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان ہے! میں ان سے جو کہہ رہا ہوں، تم اس کو ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو۔''

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں، آپ نے فرمایا:

«إِنَّهُمُ الْآنَ يَسْمَعُونَ مَا أَقُولُ» [2]

''میں جو کہہ رہا ہوں، اس وقت وہ سن رہے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو کوئی بات سنوانا چاہے تو وہ سن لیتے ہیں، جیسے وہ اللہ کی مشیت سے دفنا کر جانے والوں کے قدموں کی چاپ سنتے ہیں یا جیسے جنگ بدر میں مارے جانے والے کافروں کو زجر و توبیخ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گفتگو سنوادی۔ مُردوں کو یہ سنوانا اللہ کا کام ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اس کے لیے کوئی کام ناممکن نہیں۔ لیکن کیا ہم جب چاہیں اور جو چاہیں، ان کو سنوا سکتے ہیں؟ نہیں۔ یقیناً نہیں۔

پھر جب وہ سنتے ہی نہیں ہیں تو ہم ان کو السلام علیکم کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے نہیں کہتے کہ وہ سنتے ہیں بلکہ صرف اس لیے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ کے ساتھ ان کے حق میں دعا کرنے کا حکم دیا ہے۔ ہم آپ کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے ان کے لیے مذکورہ

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب قتل أبي جهل، حديث: 3976

[2] صحيح البخاري، المغازي، باب قتل أبي جهل، حديث: 3980، 3981

الفاظ میں امن وسلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ کسی کے حق میں دعا کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اسے سنتا بھی ہو، مسلمان ایک دوسرے کے لیے غائبانہ دعا بھی کرتے ہیں، اس میں اخلاص بھی زیادہ ہوتا ہے اور غائبانہ دعا کی فضیلت بھی زیادہ ہے۔ قرآن کریم سے اور احادیث سے ثابت ہے کہ فرشتے اہل ایمان کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعائیں کرتے ہیں۔ انھیں کون سنتا ہے؟ صرف اللہ سنتا ہے اور اسی کو سنانا مقصود ہوتا ہے۔ اہل قبور کو سلام بھی ان کے لیے سلامتی کی دعا ہے، وہ اسے سنتے ہیں یا نہیں سنتے؟ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ان کو سنانا ہمارا مقصود ہی نہیں ہے اور نہ عقیدہ ہی یہ رکھنا چاہیے کہ وہ سنتے ہیں، ہمارا مقصود تو اللہ کی بارگاہ میں ان کے لیے دعا کرنا اور اسی کو سنانا ہے، اسی نے اس کو سن کر قبول کرنا ہے، کوئی اسے سنے یا نہ سنے؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

صحابۂ کرام کا بھی یہی عقیدہ تھا، اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مُردوں سے گفتگو کرتے ہوئے سنا تو تعجب کا اظہار کیا اور کہا، اللہ کے رسول! آپ ان سے باتیں کر رہے ہیں جو بے جان ہیں، یعنی سن نہیں سکتے۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ سنتے ہیں، تمھارا یہ کہنا غلط ہے کہ وہ سنتے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ فرمایا کہ اس وقت وہ سن رہے ہیں بلکہ تم سے زیادہ سن رہے ہیں۔ کیونکہ اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو سنوا رہا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ان کو سنوانا ہمیں اس کا علم اللہ کے پیغمبر کی زبان مبارک سے ہوا جس سے زیادہ سچی زبان کسی کی نہیں، اس لیے قرآن وحدیث سے اسی عقیدے کا اثبات ہوتا ہے کہ فوت شدگان عام حالات میں نہیں سنتے۔ کوئی ان کو سنوانا چاہے، تو یہ ایک بے کار عمل ہے، کوئی ان کو نہیں سنوا سکتا، سوائے اللہ تعالیٰ کے۔

فوت شدہ بزرگوں کی بابت سماع کا عقیدہ مشرکانہ عقیدہ ہے

بنابریں کوئی کتنا بھی نیک اور پارسا ہو، فوت ہونے کے بعد وہ کسی کی بات سننے پر قادر نہیں، اس کو اپنا محرمِ راز جان کر اس سے دعائیں اور التجائیں کرنا، اسے ﴿ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴾ (سینوں کے راز جاننے والا) اور عالم الغیب اور مشکل کشا سمجھنا اور یہ ساری صفتیں صرف اللہ تعالیٰ کی ہیں، کسی اور کے اندر یہ صفتیں تسلیم کرنا، اس کو اللہ کی صفات میں شریک ٹھہرانا ہے، اسی کا نام شرک ہے۔ فوت شدہ بزرگوں، ملنگوں اور فقیروں سے طلب حاجات کے لیے دعائیں اور التجائیں کرنے والے اسی شرک صریح کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس کی مزید دلیل یہ ہے کہ ایسے بدعقیدہ لوگ ان کی قبروں کے سامنے دست بستہ تعظیماً کھڑے ہوتے ہیں، کئی تو ان کی قبروں کے آگے سجدہ ریز تک ہوتے ہیں، ان سے خوف کھاتے اور نفع نقصان کی امید رکھتے ہیں، ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں، ان کی قبروں کا طواف کرتے ہیں۔ ان سے اپنی امیدیں وابستہ کرتے ہیں اور ان سے اسی طرح عاجزانہ التجائیں کرتے ہیں جس طرح ایک مؤحد اللہ تعالیٰ سے دعائیں اور التجائیں کرتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک بات اس عقیدے کی غماز ہے کہ یہ لوگ فوت شدگان کے اندر اسی طرح الوہی صفات تسلیم کرتے ہیں جیسے مشرکین مکہ لات و منات اور عُزّٰی و ہبل نامی بتوں کے اندر تسلیم کرتے تھے یا دیگر بتوں کے پجاری اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے معبودوں کے لیے تسلیم کرتے ہیں۔ صرف ناموں اور شخصیات اور شکل و صورت کا فرق ہے۔ کسی نے اسے بت کی شکل میں ڈھال کر اسے بٹھا یا کھڑا کر دیا ہے اور کسی نے قبر کی ڈھیری کو سنگ مرمر لگا کر یا اس پر عالیشان قبہ بنا کر اس کو الوہی صفات کا حامل بنا دیا ہے، عقیدہ دونوں جگہ ایک ہی کارفرما ہے۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ۔ اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا:

اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

اور مسلمانوں کے اسی اختیار کردہ کاروبار لات ومنات کے بارے میں مولانا حالی نے کہا تھا:

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر
جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر

کہے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر
کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں

مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کر مانگیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

وہ دین جس سے توحید پھیلی جہاں میں
ہوا جلوہ گر حق زمین وزماں میں

رہا شرک باقی نہ وہم وگماں میں
وہ بدلا گیا آکے ہندوستاں میں

ہمیشہ سے اسلام تھا جس پہ نازاں
وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں۔ [1]

---

[1] مدّو جزر اسلام، المعروف مسدس، حالی، ص:120-121